حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

حافظ محمد ثاقب نیاز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۰ء

حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر: تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

حافظ محمد ثاقب نیاز

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۰ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ہائیر لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر: تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: حافظ محمد ثاقب نیاز رجسٹریشن نمبر:MU-URD-F18-1574

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان وادب اردو

ڈاکٹر نازیہ یونس: ------------------------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی:

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز ------------------------

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان:

پروریکٹر اکیڈمکس ------------------------

تاریخ:----------------

اقرار نامہ

میں حافظ محمد ثاقب نیازحلفیہ بیان کرتاہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیامواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

حافظ محمد ثاقب نیاز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۰ء

فہرستِ ابواب

مقالے کا دائرہ کار

راقمِ مقالہ نے اپنی تحقیق بعنوان "حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ "کا میدان منتخب کیا ہے۔

پہلے باب کا عنوان"موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث"ہے۔ اس باب میں موضوع کا تعارف، حنیف باوا کا تعارف ، مختصر کوائف اور سوانح، معاشرہ اور طبقات ، پسماندگی کا مظاہر، طبقاتی کشمکش اور جاگیر دارانہ نظام ، اور معاشی بدحالی کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان" حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیوں کا عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ "ہے۔ اس باب کو تین اجزا میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں معاشی بدحالی کی کہانیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں طبقاتی کشمکش کی کہانیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں ثقافتی پسماندگی کی کہانیوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان "حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کردار عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ "ہے۔ اس باب میں پسماندہ طبقے کے کرداروں جن میں خوانچہ فروش، گداگر، لکڑہارے، بھانڈ، موچی، گھسیار، مزدور، دیوانے، ملازمت پیشہ افراد، محنت کش عورتیں، مفلوک الحال ادیب، بیرونِ ملک روزگار کی تلاش میں جانے والے افراد، کوچوان شامل ہیں۔ ان کرداروں کا الگ الگ مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں مجموعی جائزہ کے عنوان سے تحقیق کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس میں دورانِ تحقیق جو نتائج سامنے آئے انھیں بیان کیا گیا ہے۔ تمام تحقیق کو مد نظر رکھ کر اس باب کے آخر میں سفارشات بھی مرتب کی گئیں ہیں۔

ABSTRACT

This analytical as well descriptive study aimed to find out the modern perspective of backward society in Urdu fiction's of Hanif Bawa. In this study two fictional writings "تنہایوں کےدرمیاں" and "ادھورےہاتھ" have been discussed. These writings portray the conflict between different strata of the society, economical down turn and cultural down turn of the backward society of the south Punjab. Hanif Bawa is a great fictional writer who beautifully portrays social, cultural background in modern prospective of the less developed area like south Punjab in an artistic manner. His writing clearly depicts the drawbacks of the south Punjab community. He also faced these sufferings so he is a well aware of these conflict among different divisions of the society. So, the major focus of this study is to find out divergence of culture, socio- economic status and sufferings of backward society in Hanif Bawa's writings.

This study clearly mentions that Hanif Bawa's writing depicts the poor condition of low classes of the society and all these classes associated to each other in term of economy. His writings show the class difference, their living condition and their miseries of life. His characters' lives revolve around economic stability, hardworking however, poverty leads them to different crimes and this situation creates a chaos in the society and also it has negative impact in the society.

Analytical and descriptive approach have been used to find out these cultural differences in Hanif Bawa's writings. Data has been collected through libraries, magazines, surveys and interviews including author's interview. first chapter introduces the short introduction of the writer, major classes of the south Punjab society and social status of the society. Second chapter reflects the writer's major works that shows the economic and social down turn of the society. Third chapter discusses the role of characters in backward class and about their major professions. And the last chapter concludes the overall assessment, and the results of findings.

مقالے کا مقصد

یہ تحقیقی مقالہ "حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ" سے معنون ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا مقصد حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیوں کا عصری تناظر، پسماندہ طبقے کے کرداروں کے افعال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور پسماندہ طبقے کے کرداروں سے وابستہ المیوں کا جائزہ لینا ہے اور واضح کرنا کہ ان تمام محرکات کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اس بات کا بھی جائزہ لینا کہ پسماندہ طبقے کی کہانیوں کی نوعیت کیا ہے۔ اس تحقیق میں معاشرہ، طبقات، پسماندگی کے مظاہر، جاگیر داری نظام، سرمایہ داری نظام، معاشی بدحالی، طبقاتی کشمکش اور ثقافتی پسماندگی وغیرہ عناصر پر تنقیدی نگاہ ڈالنا بھی اس مقالے کا مقصد ہے۔

اس تحقیق میں دیہی علاقوں کے کرداروں اوران کے پیشوں کا بھی جائزہ لینا مقالے کے مقصد میں شامل ہے۔ ان کردارں کے المیوں، دکھ، درد اور کرب کی وجوہات بھی شامل ہے۔ ان کرداروں کی معاشی بدحالی سے پیدا ہونے والے جرائم و مسائل کا تعین کرنا بھی تحقیقی مقالے کا مقصد ہے۔ پسماندہ طبقے کی فلاح و بہبود پر کام کرنے والے قومی و نجی اداروں کے سروے سے مشاہدہ اخذ کرنا مقالے کا مقصد ہے۔

اظہارِ تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنااور شکر گزاری کے اظہار کے بعد اپنی استاد اور نگرانِ مقالہ ڈاکٹر نازیہ یونس کا انتہائی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں ہر لمحہ میری راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ تحقیق کے اس پر خار راستے پر متعدد بار میرے قدم ڈگمگائے تو انھوں نے نہ صرف میری راہنمائی کی بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی اور روشنی کا مینار ثابت ہوئیں۔ میں ان کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عابد سیال کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے موضوع کے انتخاب میں نہ صرف راہنمائی کی بلکہ انتہائی مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کے ان مشوروں کی بنا پر اس مقالے کی تکمیل میں بہت راہنمائی کی۔ شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ جن میں ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر رانا محمود، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر رخشندہ مراد ڈاکٹر روش ندیم، ڈاکٹر رفیق الاسلام، ڈاکٹر عبد الستار نیازی خاص طور پر شامل ہیں جنھوں نے مختلف مواقع پر میری مدد کی اور محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ خاص طور پر میں ایم فل کی کوارڈینیٹر ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ایم فل کی تمام سرگرمیوں کا بروقت انتظام کرکے طلبا کا قیمتی وقت بچایا اور انھیں متحرک رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ شعبہ اردو کے شعبے کے دیگر افراد جن کا فرداً فرداً نام لینا ممکن نہیں ہے، کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سے میری مدد اور راہنمائی کی۔

اظہارِ تشکر کی فہرست طویل ہے اور شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ ان تمام احباب کے لیے دعا گو ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح میری مدد یا راہنمائی کی۔

حافظ محمد ثاقب نیاز

ایم فل سکالر

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

۱۔ موضوع کا تعارف

حنیف باوا کا شمار اردو افسانے کے حوالے سے معروف لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں میں عام قسم کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ارد گرد سے موضوعات اور کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ حنیف باوا اپنی کہانی کا سارا مواد اپنے ارد گرد لہکتی خوشیوں ، جسموں کو چاٹتے غموں، دہکتے دکھوں اور دندناتی ہوئی ناانصافیوں سے اخذ کرتا ہے۔ جس وجہ سے وہ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے بہت جلد اردو ادب کی دنیا میں شہرت حاصل کی اور شائقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ۔ ان کے افسانے مختلف رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ جن میں "فنون"، "الحمرا"، چہار سو"، "بیاض " اور "ادبیات "شامل ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں "تنہائیوں کے درمیاں "اور "ادھورے ہاتھ "شامل ہیں ۔ اردو زبان کے علاوہ "گورمکھی رسم الخط "اور پنجابی زبان میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے پنجابی افسانے کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں ۔یہ تحقیق ان کے دو اردوافسانوی مجموعوں "تنہائیوں کے درمیاں "اور "ادھورے ہاتھ" کے حوالے سے پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیہ پر مشتمل ہے۔

۲۔ بیانِ مسئلہ

حنیف باوا کے افسانے اردو ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ حنیف باوا کی سماجی نظر بہت گہری ہے۔ ان کے افسانوں میں عام کرداراور موضوعات پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے بطور خاص پسماندہ طبقے کے رہن سہن، عادات و خصائل اور مشکلات و مصائب پر مبنی کہانیاں لکھی ہیں۔ انھوں نے اپنے بہت

سے کردار بھی اسی معاشرت سے چنے ہیں ۔اس لیے ان کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔ تاکہ متعلقہ مسائل ومباحث تک رسائی حاصل ہو سکے۔

۳۔ مقاصدِ تحقیق

ا۔ حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیوں کا عصری تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۔ حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کے افعال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں سے وابستہ المیوں کی نوعیت کا جائزہ کو بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ تحقیقی سوالات

ا۔ حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیوں کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں سے وابستہ المیوں کے معاشرے پر کیا اثرات ہیں؟

۳۔ حنیف باوا کے افسانوں میں سماجی ناہمواریوں سے پسماندہ طبقے کے کرداروں کے افعال پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار

حنیف باوا کے اردوافسانوں میں پسماندہ معاشرت اوراس کے ساتھ وابستہ وہ تمام مسائل پائے جاتے ہیں۔ جن کی طرف عام طور پر اشرافیہ کی نظر نہیں جاتی۔ حنیف باوانے دیہی معاشروں میں غربت ،افلاس، بیماری اور دکھ تکلیف کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اوراپنے افسانوں میں اس کو جگہ دی ہے۔ خاص طور پر جنوبی پنجاب کی پسماندہ معاشرت کو مد نظر رکھ کر حنیف باوا کے اردوافسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ معاشی

بدحالی کی وجہ سے معاشرے میں پسماندگی پھیلتی ہے۔دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے انسان کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو وہ جرائم کی طرف مائل ہوتا ہے جس سے بہت سے معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں۔جن میں چوری،ذات پات،حسد،طبقاتی کشمکش،دھوکہ دہی،بے روزگاری،رشوت ستانی وغیرہ سرفہرست ہیں۔زیرِ نظر تحقیق میں مذکورہ بالا تمام مظاہر زیر بحث آئے ہیں۔لیکن ہمارا بنیادی موضوع پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں جائزہ پیش کرنا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

تحقیق کا موضوع "حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر تجزیاتی مطالعہ "ہے۔ان کی ادبی خدمات کے حوالے سے متعدد ناقدین نے اظہارِ خیال کیا ہے۔لہذا موضوع سے متعلق مطبوعات کی جمع آوری ،ترتیب اور مطالعہ و تجزیہ کرنا ضروری ہے۔اس تحقیقی کام میں تجزیاتی اور مشاہداتی طریقہ کار کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ بنیادی مآخذات میں حنیف باوا کی کتابیں جبکہ ثانوی مآخذات کے طور پر حنیف باوا کے افسانوں پر چھپنے والے مختلف مضامین،کتب اور رسائل و جرائد کا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان قومی اداروں "پاکستان بیت المال،،بینظیر انکم سپورٹ پروگرم،اور قومی ادارہ برائے مردم شماری" سے بھی پسماندہ طبقے کی شرح اور درپیش مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل کرکے اس کو اپنے خیال کے مطابق زیر بحث لایا ہوں ۔اس کے ساتھ جنوبی پنجاب کے دیہی علاقوں کا مشاہدہ بھی شاملِ تحقیق کیا ہے۔دریا کے کنارے اور صحرا میں بسنے والے مقامی لوگوں کی حالت پر کام کرنے والے اداروں کے ذمہ داران کی رائے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ بنیادی مآخذات تک رسائی کے لیے مختلف لائبریریوں سے رجوع کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ اور دیگر مآخذ آت سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ زیر نظر موضوع پر ماقبل تحقیق

حنیف باوا معاصر افسانے میں ایک نمایاں مقام کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ان کی ادبی خدمات پر متعدد ناقدین اپنے آراء کا اظہار کیا ہے۔حنیف باوا کی نثری تحریروں پر "حنیف باوا کی نثری خدمات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ "کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں ایم فل کی سطح کا ایک مقالہ تحریر کیا جا چکا ہے۔۔اس کے علاوہ ایم

اے کی سطح پر "حنیف باوا حیات اور خدمات" کے عنوان سے ۲۰۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک مقالہ لکھا گیاہے۔پنجابی زبان میں پانچ مقالے لکھے جاچکے ہیں۔ جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

ا۔"حنیف باوادی کہانیاں دافنی تے فکری مطالعہ "ایم فل پنجابی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،۲۰۱۷ء

۲۔"حنیف باوادی کہانیاں دی کتاب "دھوانکھیاہوا آدمی" داتجزیاتی مطالعہ "لاہوریونیورسٹی لاہور،۲۰۱۶ء

۳۔حنیف باوادی کہانیاں دامجموعہ "کہانی" داتجزیاتی مطالعہ "لاہوریونیورسٹی لاہور،۲۰۱۶ء

۴۔"حنیف باوادی کہانی کاری"اورینٹنل کالج،پنجاب یونیورسٹی لاہور،۲۰۱۶ء

۵۔"حنیف باوابطور پنجابی افسانہ نگار تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ"،اورینٹنل کالج،پنجاب یونیورسٹی لاہور،۲۰۱۶ء

اس کے علاوہ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے کئی مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے اردو افسانوی مجموعوں پر ابھی تک پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا جس پر تحقیق کی ضرورت تھی اس کو پائے تکمیل تک پہنچایا گیا ہے۔

۸۔ تحدید

موجودہ تحقیق حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر کے تجزیے پر مشتمل ہے۔جو ان کے دو اردو مطبوعہ افسانوی مجموعوں "تنہائیوں کے درمیاں" اور "ادھورے ہاتھ" پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ دیگر تحریریں مقالہ کی تحقیقی حدود سے باہر ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر افسانوی نثر کے مطالعے پر مبنی کتب اور مضامین کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔خاص طور پر جن کتب میں حنیف باوا وران کے معاصرین کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔اس کو شاملِ تحقیق کیا گیاہے۔اس کے علاوہ مختلف ناقدین کی آراء، تبصروں اور تجزیوں کو بھی شاملِ تحقیق کیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

حنیف باوا کے افسانوں نے افسانوی نثر کے فہم اورافسانہ نگاری کے فن کو فروغ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں نے معاصر افسانوی ادب میں نمایاں مقام پایا ہے۔ تاہم ان کی ادبی خدمات وقت کی دھند میں چھپ گئی ہیں۔ حنیف باوا کے اردو افسانوں پر ان کے استحقاق کے مطابق کم کام ہوا ہے۔ حنیف باوا کے پنجابی افسانوں پر بہت کام ہوا ہے۔ دیکھا جائےتو ان کے اردو افسانے بھی اسی معیار کے ہیں۔اردو افسانوں میں پنجابی افسانوں کی طرح عام موضوعات، کردار، دکھ ادر خواہشات کا ذکر کیا ہے لیکن ان پر بہت کم کام ہوا ہے۔حنیف باوا نے پسماندہ معاشرت کے مسائل پر قلم اٹھا کر انسان دوستی اورحب الوطنی کو فروغ دیا ہے۔ تاہم ضرورت اس امر کی تھی کہ ان کی تحریروں کا پسماندہ معاشرت کے مسائل کے حوالے سے عصری تناظر میں تجزیہ کیا جائے اوران کی خدمات پر مختلف جہات سے تنقید اور تحقیق کی جائے۔ یہ مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔

ب۔ حنیف باوا کے احوال و آثار

اصل نام محمد حنیف باوا(۱۹۳۴ء) جبکہ قلمی نام حنیف باوا ہے۔حنیف باوا کے والد محترم کا نام امام دین اوروالدہ محترمہ کا اسم گرامی شریفاں بی بی ہے۔ اُن کے والدین اس دنیا سے انتقال کر چکے ہیں۔ اُن کے مطابق والد کا انتقال ۱۹۹۳ء جبکہ والدہ ۲۰۱۱ءمیں اس دنیافانی سے رحلت فرما گئیں۔ آباؤ اجداد کا تعلق انصاری خاندان سے ہے۔ جبکہ پیشے کے حوالے سے پارچہ بافی سے منسلک تھے۔ آباؤ اجداد کے پیشے کے حوالے سے راقم الحروف کو گفتگو میں بتاتے ہیں:

> ”میرا تعلق مشرقی (پنجاب) کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرانوالہ کے ایک گاؤں چک سرائے سے تھا۔ میرے آباؤ اجداد کا پیشہ پارچہ بافی تھا۔ مجھے تو معلوم نہیں یہ پیشہ کب ہمارے خاندان کا حصہ بنا مگر اتنا ضروریاد ہے کہ یہ پیشہ میرے دادا نے اپنے باپ دادا سے ورثے میں حاصل کیا۔ اس پیشے کا اختتام مجھ پر ہوا“ (۱)

اُن کی تاریخ پیدائش میں اصل اور شناختی کارڈ کے حوالے سے واضح فرق ہے۔شناختی کارڈ ۱۹۳۶ءاور اصل تاریخ پیدائش ۱۹۳۴ء میں دو سال نمایاں فرق ہے۔ اس فرق کے بارے میں اُن کے بقول "میں ۱۹۳۴ء میں پٹیالہ (بھارت) کی تحصیل پائل میں پیدا ہوا۔میری اصل تاریخ پیدائش ۱۹۳۴ء جب کہ میرے اسکول سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ کے مطابق میری تاریخ پیدائش ۱۹۳۶ءہے۔"(۲) اُن کے آباؤ اجداد کئی صدیوں سے مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرانوالہ کے گاؤں چک سرائے میں مقیم تھے۔اُن کے داد کے پانچ بیٹے جبکہ کوئی بیٹی نہیں تھی۔جو امام دین، شمشیر علی، رحم دین، روشن دین اور فقیر محمد تھے۔سب کے سب اپنے آبائی پیشے پارچہ بافی سے منسلک تھے۔وہ اپنے باپ دادا کے ساتھ ملکر زمینی کھڈی پر اس وقت کا مشہور کھدر کا کپڑا بناتے تھے۔یہ کھدر مختلف زمینداروں سے حاصل کرتے اور اس کو کئی مراحل سے گزار کر اس سے کپڑا تیار کرتے تھے۔اس کپڑے کے عوض اُن زمینداروں سے مکئی ، گندم اور نقدی حاصل کرتے تھے۔یہ اس طرح سے اپنے کنبے کا نظام چلاتے تھے۔باوا اپنے آبائی پیشے پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> "میرے آباؤ اجداد زمینی کھڈی پر کھدر کا کپڑا تیار کرتے تھے۔یہ کھدر ان کا اپنا نہیں ہوتا تھا بلکہ گاؤں کا کوئی سکھ زمیندار ہمیں دھاگا دے جاتا تھا اور اس سے ہم کپڑا تیار کرتے تھے جس کے عوض ہمیں گندم، مکئی یا نقد رقم دی جاتی تھی۔"(۳)

وہ اپنے گھر میں سب سے بڑے تھے۔اُن کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔جس کا نام محمد عبد اللطیف تھا۔والد کی طرح ان کی بھی بہن نہیں تھی ۔اپنی پیدائش اور خاندانی روایت کے مطابق ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں کہ "ہمارے خاندان کی روایت کے مطابق اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کے ناطے سے میری پیدائش ننھیال تحصیل پائل میں ہوئی۔ لیکن میں پڑا بڑھا ضلع لدھیانہ کی تحصیل سمرانوالہ میں"(۴)

اُن کے آباؤاجداد کئی دہائیوں سے پارچہ بافی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ اس لیے اُن کے خاندان میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔باوا کے ماں باپ بھی اَن پڑھ تھے۔ لیکن یہ دونوں ارد گرد کے ماحول سے بہت متاثر ہوئے۔اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو تعلیم دلوانے کا سوچا۔جب ان کی عمر ۶ سال ہوئی تو والد نے چک

سرائے سے دو کوس فاصلے پر واقع آر۔ایس خالصہ ہائی سکول میں داخل کروادیا۔ یہ سکول جیسالوں نامی گاؤں میں واقع تھا۔ یہ سکول دو حصوں پر مشتمل تھا۔ایک حصے میں پرائمری اوردوسرے میں ہائی کلاسز کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس سکول اور چک سرائے میں زیادہ تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی تھی ۔ اُن کے زیادہ تر دوست اور کلاس فیلوایسی کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے۔حنیف باوااپنے اسکول اوردوستوں کا احوال بقول باوا

"چک سرائے کی مشرقی جانب آر۔ ایس خالصہ ہائی اسکول تھا ۔جہاں میں اور میرے بچپن کے ہم جماعت مل کر سکول جایا کرتے تھے۔اس لئے میرے زیادہ تر دوست اور کلاس فیلو ہندو کمیونٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چک سرائے میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔"(۵)

اُس کے والدین اَن پڑھ ہوتے ہوئے تعلیم سے شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے شروع سے اپنے بچے کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ والدین کی تربیت اور لگن کی بدولت اُس اپنے کنبے میں تعلیم حاصل کرنے والے پہلے فرد بنے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ہندو اور سکھ اساتذہ سے حاصل کی ۔اُن کے اساتذہ بہت محنتی اور شفیق تھے۔ جن کی بدولت انھیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ سکھ اور ہندو کمیونٹی کے ساتھ رہنے کے باوجود بھی مذہبی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اُن کے والدین نے انہیں قرآن کی تعلیم دلوانے کا بندوبست بھی کیا تھا۔اس قرآنی تعلیم کے بارے میں باوا کا بیان یہ ہے:

"ہمارے آس پاس کے مسلمان گھرانوں کے بچے ہمارے گھر آتے تھے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی ان کے ساتھ مل کر قرآن مجید پڑھا کرتے تھے۔ ایک مولوی صاحب روزانہ عصر کے وقت ہمارے گھر آتے تھے اور ہمیں قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔"(۶)

اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق پسماندہ طبقے سے تھا۔ وہ چک سرائے میں ایک سکھ زمیندار کے رعایا تھے۔ ان کے آباؤ اجداد نے سادہ اور کسمپرسی کی زندگی بسر کی تھی ۔ان کا آبائی گھر خستہ حالت میں تھا۔ جہاں اُن کا خاندان رہائش پذیر تھا۔ ان سب حالات کے باوجود ان کو جو مل جاتا اسی پر گزر بسر کرتے تھے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ حنیف باوا بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلے۔ انہوں نے طالب علمی کا زمانہ

انتہائی سادگی سے بسر کیا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس وقت کے روایتی کھیلوں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔اپنے بچپن کے کھیلوں اور گاؤں میں گزرے ہوئے وقت کا احوال بقول حنیف باوا:

> ”گاؤں کی وہ گلیاں جن میں چلتے پھرتے میرا بچپن گزرا مجھے یاد آتا ہے۔ گاؤں میں میرے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سکھ اور ہندو بھی دوست تھے۔ چاندنی راتوں میں ہم سب دوست مل کر گُلو، پیچو بکری اور لُکن وغیرہ کھیلتے تھے۔“ (۷)

جب ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس وقت برصغیر پاک وہند کے حالات نامساعد تھے۔ تقسیم کاری کی مہم چل رہی تھی۔ سکول میں اسلام دشمن اساتذہ کی بدولت مسلمانوں کے خلاف ادبی پروگرام میں ہرزہ سرائی کی جانے لگی۔ مسلمان بچوں کو اسکول میں حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس قسم کی فضا اور ذہنی گھٹن کی بدولت حنیف باوا کو تدریس کے شعبے کو چھوڑنا پڑا۔ حالات کی بہتری اور ایک طالب علم کے کہنے پر دوبارہ سے حنیف باوا کو سکول میں داخل کروایا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تقسیم کار تحریکوں نے زور وشور سے مہم چلائی ہوئی تھی۔ حالات بہت خراب تھے۔ مسلم ہندو دشمنی عروج پر تھی۔ انسان انسان کا دشمن بن گیا تھا ،۔ ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت اور عصمت دری کا بازار گرم تھا۔نامساعد حالات کے بارے میں ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> ”جب ہندوستان میں آزادی کی تحاریک چل رہی تھیں۔۔۔۔ میں چونکہ اس وقت اپنے سنِ شعور کو نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے آزادی کے بارے میں میرے سامنے جو بھی بات ہوتی تھی وہ میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہاں البتہ جب میں خود اپنے ننھال جاتا تو وہاں جو نعرے سننے کو ملتے وہ کچھ یوں تھے۔" نعرہ تکبیر" ،اللہ اکبر"۔" لے کے رہیں گے پاکستان"،"بن کے رہے گا پاکستان"۔"پاکستان زندہ باد"۔" بندے ماترم"۔" جو بولے سونہال"۔"ست سری آکال" وغیرہ وغیرہ۔“ (۸)

برصغیر پاک وہند کی تقسیم عروج پر تھی۔ ہر طرف جلسے جلوس کا رواج عام تھا۔ ان کشمکش کے حالات میں انہیں ایک دفعہ اسکول بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ اسکول میں دوسرے مذاہب کے اساتذہ تھے۔ جو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تحریکوں پر بھی بحث کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک سکھ طالب علم سے اُن کی لڑائی ہوگئی۔

ان نامساعد حالات میں اُنہیں ایک سال تک تعلیمی سر گرمیوں کو روکنا پڑا۔ ایک سکھ دوست کے کہنے پر دوبارہ سے سکول میں داخل کروادیا گیا۔

زمانہ طالب علمی میں عشق نہ ہو یہ ہو نہیں سکتا۔ باوا کی زندگی سے بھی اس قسم کا ایک عجیب واقعہ جڑا ہوا ہے۔ "دیپو" نامی سکھ لڑکی سے اُن کو عشق ہوا۔ لیکن یہ کہانی بے انجام حنیف باوا کے ذہن میں پردہ نشین ہو گئی۔ کیونکہ مشرقی معاشرے میں ذات پات اور مذہب جیسی رسوم عشق مجازی کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ حنیف باوا کی دیپو ایک سکھ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس کے بارے میں وہ ملاقات کے دوران بتاتے ہیں۔ " میری عمر تقریباً ۱۴ برس تھی۔ ہمارے گاؤں کے ایک درزی کی نواسی میرے دل میں بسیرا کر گئی۔ جو ہمیشہ کے لئے میری یادوں کی جیون ساتھی بن گئی۔ " [۹]

ماضی کے حسین واقعات کو یاد کر کے اُنھوں نے سرد آہ بھری اور پھر سے بات چیت کا سلسلہ جاری کیا۔ عشق و محبت کی حسین وادیوں سے نکل کر وہ نے برصغیر پاک و ہند کے واقعات پر روشنی ڈالی۔ اُن کے بقول جیسے جیسے آزادی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار جیسے واقعات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہمارے خاندان کو یہ علم ہو گیا تھا کہ اب اس گاؤں میں ہمارا گزر بسر مشکل ہے۔ اس لیے وہاں سے ہجرت کرنا ہی سودمند ثابت ہو گا۔ تمام رشتہ داروں نے ہمارے ساتھ ہی اس گاؤں کو خیر آباد کہا اور قیام پاکستان سے ایک ماہ پہلے میرے نانا کے گاؤں آ گئے۔ وہاں سے اپنے ننھال والوں کے ساتھ ہجرت کا آغاز کیا اور ایک کیمپ میں پناہ لی۔ کچھ دن وہاں گزارنے کے بعد ایک ٹرین آئی جس میں لوگ افراتفری کے عالم میں سوار ہو رہے تھے۔ اس کے بارے حنیف باوا رائے دیتے ہیں:

> "نامساعد حالات کی وجہ سے ٹرین جالندھر میں رُکی رہی، بالآخر ایک بہادر مسلمان سپاہی نے جوشیلے انداز میں کہہ کر غیر مسلم ڈرائیور کو ٹرین چلانے پر مجبور کیا ۔۔۔۔ جب ہماری گاڑی پاکستان کے حدود میں داخل ہوئے تو ہماری جان میں جان آئی اور ہم سب مسافر پاکستان کے دور میں داخل ہونے کی خوشی میں نعرے لگانے لگے " پاکستان زندہ باد"۔ [۱۰]

اس مشکل ترین سفر کو طے کرنے کے بعد پاکستان پہنچے تو سارے کا سارا منظر "یا خدا" کی کہانی جیسا تھا۔ کاغذوں میں سب کچھ پر عملی طور پر کچھ نہیں۔ لاہور میں کوئی کیمپ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے خاندان نے گوجرانوالہ کا سفر کیا۔ کچھ دن کے قیام کے بعد مالی مشکلات کی وجہ سے انہیں کسی صنعتی علاقے کا رُخ کرنا پڑا۔ جہاں محنت مزدوری کر کے اپنے خاندان کی کفالت کی جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اس وقت کے (لائل پور) موجودہ فیصل آباد کا سفر کیا۔ کیونکہ لائل پور کپڑے کے حوالے سے برصغیر میں اہم مقام رکھتا تھا۔ اُن کا خاندان بھی پارچہ بافی کا ماہر تھا۔ اس لیے انہوں نے یہاں سکونت اختیار کی۔ لائل پور میں بھی انہیں شروع شروع میں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ”ہم ایک ماہ لائل پور رہے۔ لوگوں سے سنا کہ یہاں پر کپڑے، بستر اور دیگر اشیاء خورد و نوش تقسیم ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ سب کی سب افواہیں تھیں۔“[۱۱]

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد ہر طبقہ مالی مشکلات اور رشتہ داروں کی جدائی سے پریشان تھا۔ حنیف باوا اور اُن کے رشتے داروں نے دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ آخر کار لائل پور (فیصل آباد) سے بھی ہجرت کرنا پڑی۔ لائل پور میں قیام کے ایک ماہ بعد ہی اُنہوں نے جھنگ کا سفر اختیار کیا۔ جھنگ میں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ جنگ شہر "چکی والی گلی "وارڈ نمبر ۷ میں رہائش پذیر ہوئے۔ ایک دفعہ پھر سے انہوں نے تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ایم۔ بی۔ ہائی سکول جھنگ میں چھٹی جماعت میں داخل ہوئے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آخر کار ۱۹۵۲ء میں میٹرک اسی ہائی سکول سے پاس کی۔ ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ فارمل سکول چنیوٹ میں جے۔ وی کا ڈپلومہ کیا۔ اس ڈپلومے کے فوراً بعد ۱۹۶۰ء میں بطور معلم پرائمری سکول میونسپل کمیٹی برانچ نمبر ۶ میں تقرری ہوئی۔ حنیف باوا کی تعلیم اور نوکری کے بارے میں شفیع ہمدم لکھتے ہیں:

> ”حنیف باوا نے میٹرک تک باقاعدہ سکول میں تعلیم حاصل کی۔ مگر نامساعد حالات کی وجہ سے وہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ چنانچہ جے۔ وی کا کورس کر کے پرائمری اسکول ٹیچر لگ گیا۔ علم کی تشنگی نے اسے چین سے نہ بیٹھنے دیا اور پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور ایم اے پنجابی کر لیا۔“[۱۲]

اُن کو بچپن سے پڑھنے لکھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اُنہیں کھیلنا اور فلمیں دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن عمر میں پختگی اور وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم کی طرف رجحان زیادہ ہو گیا۔ اُنہوں نے سادہ اور کسمپرسی کی زندگی بسر کی۔ لیکن اُنہوں نے دکھوں اور پریشانیوں کا بڑے حوصلے سے مقابلہ کیا۔ حنیف باوا کی پسماندگی اور غربت کے بارے میں شفیع ہمدم لکھتے ہیں۔ "غربت اس کے بچپن کی سہیلی ہے۔ وہ اس کے ساتھ کھیل کر جوان ہوا اور بڑھاپے میں بھی غربت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔"(۱۳)

وہ جب ملازم ہوئے تو اس وقت تنخواہ ۱۲۰ روپے تھی۔ لیکن ان مالی مشکلات کے باوجود اُنہوں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ ۱۹۶۶ء میں بطور پرائیویٹ امیدوار انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں بطور پرائیویٹ امیدوار پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ دکھوں اور پریشانیوں کے باوجود اُنہوں نے تعلیمی سفر جاری رکھا۔ بطورِ معلم اُنہوں نے سب مشکلات کا جواں مردی سے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی سفید پوشی کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔

۱۹۷۵ء میں انہوں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ایم۔ اے پنجابی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کو اب اپنی مادری زبان میں پروفیسر بننے کی خواہش پوری ہوتی دکھائی دی۔ لیکن یہ خواہش خواہش ہی رہی اور وہ تمام عمر پرائمری ٹیچر ہی رہے۔ پروفیسر بننے کی خواہش کبھی پوری نہ ہوئی۔ لیکچرار کے امتحان کے بارے میں بتاتے ہیں۔ " ایم۔ اے پنجابی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے لیکچر کے لیے انٹرویو دیا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ معاشی حالات اور سیاسی ہتھکنڈوں کی وجہ سے یہ خواہش کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔"(۱۴) جوں جوں وقت گزرا عمر میں پختگی آئی علم دوستی عروج پر جا پہنچی۔ بچپن میں کھیلوں اور فلموں کا شوقین اپنی کورس کی کتابیں بیچ کر فلمیں دیکھتا تھا۔ لیکن عقل کی داڑھ نکلتے ہی حنیف باوا نے یہ سب کچھ ترک کر دیا۔ اس سلسلے میں شفیع ہمدم لکھتے ہیں:

> "بچپن میں کورس کی کتابیں بیچ کر فلم دیکھنے والا باوا اب اپنی معمولی سی تنخواہ سے پیسے بچا بچا کر کتابیں خریدنے لگا۔ سنا ہے کہ ایک دفعہ اس نے اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کے لئے ہاتھ کی گھڑی تک فروخت کر دی تھی۔"(۱۵)

اُن کی کوئی خواہش پائیہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ جوانی میں مصوری کا بہت شوق تھا۔مالی مشکلات کے باوجود لاہور کا سفر اختیار کیا۔ میو سکول آف آرٹس لاہور جو اب نیشنل کالج آف آرٹس کے نام سے مشہور ہے۔اس میں ایک سال تک مصوری سیکھتے رہے۔ مالی حالات کی وجہ سے اس فن کو ترک کرنا پڑا۔ لیکن شوق اور لگن انسان کی روح تک کے ساتھی ہیں ۔ یہی جذبہ لے کر ایک مایہ نازاستاداللہ بخش کے پاس گئے۔لیکن بات چیت کے بعد معلوم ہوا اس فن کو سیکھنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ اس خواہش کو پسِ پردہ رہ کر گھر واپس آ گئے۔ اس بارے میں شفیع ہمدم کا بیان ہیں:

> ”اس شوق کی تکمیل کے لیے لاہور کے میو کالج آف آرٹس میں با قاعدہ ایک سال تک مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ مگر اس کا یہ شوق والدین کو ایک آنکھ نابھاتا تھا۔ ایک دفعہ چھت پر بیٹھا بڑے انہماک سے تصویر بنا رہا تھا کہ اس کے والد نے بورڈ چھین کر چھت سے نیچے پھینکتے ہوئے کہا (ایہہ کی ہل پنجالی لے کے بیہ جانداایں اس توں علاوہ ہور کوئی کم نئیں) ۔“(۱۶)

۱۹۵۰ء میں زمانہ طالب علمی کے دوران اُن کی شادی اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی۔ "دیپو" سے عشق ہونے کے باوجود بھی شادی اُن کے والدین کی مرضی سے ہوئی۔اُن کی بیگم گھریلو خاتون تھیں ۔اُن کے بطن سے چھ بچے پیدا ہوئے۔ جن میں دو بیٹے محمد انور باوا اور یاسر حنیف کے علاوہ چار بیٹیاں شمیم رشید عالم،انوری حنیف، پروین اشرف اور قیصرہ حنیف شامل ہیں۔اُن کے سب بچے شادی شُدہ ہیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے انور باوا کے ساتھ رہتے ہیں۔ جبکہ چھوٹا بیٹا یاسر حنیف اپنی زوجہ کے ہمراہ سرگودھا میں رہائش پذیر ہے۔ اُن کی بیوی اور بڑی بیٹی اس دنیافانی سے رحلت فرما گئی ہیں۔ حنیف باوااس وقت سیٹلائٹ ٹاون جھنگ میں رہائش پذیر ہیں ۔اُن کی ہمیشہ خواہش رہی کہ کسی پُر سکون علاقے میں رہیں لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اس شہر کے شوروغل میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ حنیف باوا ۱۹۹۲ء میں ملازمت سے سُبکدوش ہوئے۔ اُن کی ساری زندگی ایک خستہ حال مکان میں گزری۔ کیونکہ ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی تنخواہ تین ہزار روپے تھی۔ معاشی حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ اپنی بیٹھک کو رہائش ، مہمان خانہ اورلائبریری کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک کاروبار کی ناکامی کے بارے میں شفیع ہمدم کی گفتگو ہیں:

”ملازمت سے سُبکدوشی کے بعد پاورلومز کا کاروبار کیا ۔مگر ناتجربہ کاری کی وجہ سے راس نہ آیا اور تمام جمع پونجی بھی گنوا بیٹھا۔ اس کے بعد ایک سکول کھولا لیکن برادری اوردوستوں کے عدم تعاون کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور سکول بھی بند کرنا پڑا ۔“(۱۷)

اُن کے ادبی سفر پر نظر ڈوڑائیں تو معلوم ہو تا ہے کہ انھوں نے پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ اُنہوں نے ۱۹۵۸ء میں پنجابی زبان کا افسانہ "رومال" لکھ کر ادب کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ یہ افسانہ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے رسالے میں چھپا۔ جس کے بارے میں خیر الدین انصاری لکھتے ہیں۔ ”حنیف باوا نے اپنا پہلا افسانہ "رومال" ۱۹۵۸ء میں لکھا اور ”ویاہ" کے عنوان سے گورنمنٹ کالج جھنگ کے رسالہ "کاررواں "میں چھپا۔“(۱۸)

اُن کے افسانے "رومال "کا سندھی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اردو میں بھی ترجمے ہوئے۔ ترجمہ نگاروں نے اُن کی تخلیق کے کسی نہ کسی فن پارے کے لیے تراجم کے فرائض سرانجام دیے۔ ۱۹۸۱ء میں اُن کی پنجابی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "چرخے دی موت " اوردوسرا مجموعہ " کہانی" کے عنوان سے پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے شائع کیا۔ اُن کے پنجابی افسانوں کی شہرت اس وقت ہوئی جب اُن کے افسانے ”دھی" کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بی۔ اے کے کورس میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ افسانہ تقریبا چالیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔جی۔ سی یونیورسٹی فیصل آباد کے ایم۔اے کے نصاب میں ان کی کتاب "چرخے دی موت "شامل ہے۔ اس کے علاوہ جی۔ سی یونیورسٹی لاہور اور جی۔ سی یونیورسٹی فیصل آباد بی۔ اے کے نصاب میں بھی ان کی کہانیاں شامل ہیں ۔بلال زبیری حنیف باوا کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”جھنگ شہر کے انصاری برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجابی زبان میں یہاں کے واحد نثر نویس ہیں۔“(۱۹)

اُن کا اردو زبان کا پہلا افسانوی مجموعہ "باہر کا آدمی" ۱۹۹۱ء میں منظر عام پر آیا۔ خاکوں پر مشتمل کتاب "انصاری جو نمایاں ہوئے"۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف نثر کے میدان میں افسانوں میں طبع آزمائی کی بلکہ ڈرامے، خاکے، انشایئے، مضامین اور تراجم بھی کیے ہیں ۔ پنجابی زبان میں اُن کا ایک ڈرامہ

"چورنئیں آن لگے" ریڈیو پاکستان سے تشہیر ہوا ہے۔ انگریزی زبان کے ناول "سدھارتھ" کا پنجابی ترجمہ ۲۰۱۹ء میں کیا۔ انگریزی کے علاوہ روسی زبان کی کہانیوں کے تراجم کیے جو "سویرا انٹرنیشنل" میں چھپے ہیں۔ تمام تر مشکلات، ناکامیوں اور پریشانیوں کے باوجود ادب کے حوالے سے جھنگ میں قندیل روشن کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں وہ بتاتے ہیں:

> "ایک بزم "بزمِ فروغ ادب" ایم۔بی۔ہائی سکول جھنگ میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ جس میں صرف سیکرٹری کا عہدہ رکھا گیا تھا۔ جس کے پہلے سیکرٹری خیر الدین انصاری مقرر ہوئے۔ اس کے بعد شارب انصاری اور پھر میں نے خود سیکرٹری کا فریضہ سرانجام دیا۔"[۲۰]

اُن کو ادب سے شغف اور شوق ہی اس عمر میں اُن کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ ادب اور وطن کی محبت ان کی روح کا لازمی حصہ ہیں۔ وطن کی محبت میں ایک نظم "تیرا پاکستان اے یا میرا پاکستان ہے" کے عنوان سے لکھی ہے۔ اب اُن کی عمر تقریباً ۸۶ برس ہے لیکن صحت کی ناسازی اور بڑھاپے کو بالائے طاق رکھ کر تمام توانائی کو ادب پر صرف کرتے ہیں۔ راقم الحراف کو ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء بروز منگل کے دن اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ان کی حالت بہت ناساز تھی جس کی وجہ سے مختصر نشست ہوئی۔ اُن کے دوستوں کا نام لیں تو سب سے پہلے شفیع ہمدم ہیں۔ جو مشہور افسانہ نگار، غزل گو، خاکہ نگار، اور انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ خیر الدین انصاری، انجم نیازی، معین تابش، انیس انصاری جیسے لوگ بھی اُن کے مخلص دوستوں میں شامل ہیں۔ انجم نیازی لکھتے ہیں۔ "روزِ اول سے مالی مشکلات کا شکار چلے آرہے ہیں۔ ان کو ناداری ایسی پسند آئی کہ اب اگر خوشحالی اُن کے پاؤں میں بھی پڑے تو یہ اس کو اپنی بہو بنانا بھی پسند نہیں کریں گے۔"[۲۱] حنیف باوا ادب میں کہانی نگار، شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، مضمون نگار، مترجم اور نظم نگار کے طور پر نمایاں ہوئے ہیں۔ اُنہوں نے مختلف موضوعات پر تحریریں بھی لکھی ہیں۔ جو ان کی درج ذیل تصانیف کی صورت میں موجود ہیں۔

ا۔ تصانیف

اردو تصانیف

باہر کا آدمی	افسانے	انصاری پبلی کیشنز، جھنگ
انصاری جو نمایاں ہوئے	خاکے	انصاری پبلی کیشنز، جھنگ
دائروں سے باہر آدمی	انشائیے	مثال پبلشرز فیصل آباد
تنہائیوں کے درمیاں	افسانوی مجموعہ	مثال پبلشرز فیصل آباد
گورمکھی خط سے	مضامین	مثال پبلشرز فیصل آباد

پنجابی تصانیف

دھوانکھیاہوا آدمی	افسانے	مثال پبلشرز فیصل آباد
میرے سارے اکھر	افسانے	مثال پبلشرز فیصل آباد
کہانی	افسانے	پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور
چرخے دی موت	افسانے	پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہو

پنجابی تنقیدی مضامین

مشتاق باسط دیاں کچیاں کندھاں ول جھات، لہراں، لاہور، فروری ۱۹۹۰ء

مختار بلوچ۔ پیچ دے دوہڑے، ماہنامہ ترنجن، لاہور، اپریل ۲۰۱۱ء

پنجابی کہانیاں

ماں، ماہنامہ، لہراں، لہور، ۱۹۸۸ء

دھی پہاڑ دی (اڑبک کہانی) ماہنامہ، ترنجن، لاہور، ۲۰۱۱ء

ترجمے

گورمکھی سے (کہانیاں) مثال پبلشرز فیصل آباد

پنچھر گلزار سنگھ کا ترجمہ

برف آگ اور جذبوں کا پانی، سرماہی، قرطاس، گوجرانوالہ ۲۰۱۰ء

سیدھارتھ (پنجابی ترجمہ)　　　　مثال پبلشرز فیصل آباد۲۰۱۹ء

ڈرامے

چورنئیں آن لگے، ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا

بھانارب دا، ماہنامہ، ترنجن، لاہور، مئی ۲۰۱۰ء

چھوٹی آس، ماہنامہ، ترنجن، لاہور، اگست ۲۰۱۰ء

لیکھ

بلیر پروانہ، اکھراں نال مورتاں ماہنامہ، لہراں، لاہور، نومبر ۲۰۱۱ء

منظومات

لغت آصف بشیر چستی کا منتخب کردہ کلام، شہر نعت تختی، ماہنامہ، لہراں، لاہور، نومبر، ۲۰۰۵ء

میں رکھڑا، ماہنامہ، ترنجن، لاہور، ستمبر ۲۰۰۷ء

چپ دی بکل، ماہنامہ، پنجم، لاہور، مارچ ۲۰۰۹ء

۲۔　ادبی ایوارڈ

حنیف باوا کی ادبی خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چار ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

ا۔ پہلا ایوارڈ مسعود کھدر پوش کی جانب سے "پنجابی سیلوک" ملا۔

۲۔ دوسرا ایوارڈ جھنگ والوں نے "سلطان باہو ایوارڈ" کے نام سے دیا۔

۳۔ تیسرا ایوارڈ" سمیع اللہ قریشی ایوارڈ "ڈسٹرکٹ بار کونسل جھنگ میں دیا گیا۔ جو سمیع اللہ قریشی کی بیگم نے اپنے دستِ مبارک سے پیش کیا تھا۔

۴۔ چوتھا ایوارڈ "انجمن لاہور" کی جانب سے ملا۔

اُن کی ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان نے پانچ ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ہے۔

۳۔ عصری تناظر

جہاں تک عصر کا تعلق ہے اس کو عموماً زمانہ حال کے کینوس تک ہی محدود کیا جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو پھر یعنی زبان کو وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے شعور کی کاوشوں میں تفہیم عصر مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔ کیونکہ زمان محض حرکت کا ہی نام ہے۔ اگر عصر کے ساتھ ہائے نسبتی لگائے تو اس سے لفظ عصری بنتا ہے۔ جس کا مطلب کسی زمانے یا عہد کا مفہوم دیتا ہے۔ انگریزی میں اس لفظ کے لیے time or age کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں ۔ ماضی، حال اور مستقبل کو ایسے اجزاء کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جن کے باہمی اتصال سے ایک نامیاتی کل یعنی عصر تشکیل پاتا ہے۔ عصر حال کو ماضی کے ساتھ مربوط کر کے مستقبل کی امیدوں، وسوسوں اور اندیشوں کے شعوری احساس کے ساتھ موجود ہوتا ہے لہذا ہمیں عصر کو اس کے اپنے باطنی مفاہیم میں زمانی اعتبار سے کسی مخصوص عہد سے تعبیر کرنے کی بجائے وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ادب جو دوسری حسیت اور آگاہی کی بنیاد پر تخلیق ہو آفاقیت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ہر ادیب مختلف واقعات کو عصر سے جوڑ کر اپنی کہانیوں کا مواد ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔ دنیا کا بڑا ادب حقیقی واقعات پر قائم ہے۔ ادب ہی وہ آئینہ ہے جس میں سماجی مسائل و حالات کی پیش کش وہ رد عمل جو عصری حیثیت کے مرہون منت ہے پیش کیا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو پھر فکشن اپنے عصر کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس کے بل بوتے پر فکشن کی عمارت کھڑی کی جاتی جاسکتی ہے۔ فکشن حیات کی تفہیم و تشریح حقیقی حالات و واقعات کے تناظر میں گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات کی روداد کا کام کرتی ہے۔ فکشن میں عصری تناظر اور عصری حسیت، رنج و غم حسن و بد صورتی کے عمدہ اور نازک ادراک اور رد عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔

کیوں کہ یہ وہ نازک تار ہے جو کسی خارجی یا داخلی واردات کے باعث مضطرب ہوتی ہے اور عصری آگہی ابھی اور ادراک کو تحریک دیتی ہے۔ عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اپنے زمانے اوراس کے شعور سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔اس لیے ادیب اپنے عصر کی گرفت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ عصری آگہی اور اس سے جڑے شعوراور ادراک کی اہمیت ادب میں مسلمہ ہے۔ ادیب کا کام عصری حسیت کو کام میں لاتے ہوئے عصری واقعات کی شہادت ہے۔ ادیب کا کام خود سے واقعات گھڑنا یا معلومات کا تعین کرنا نہیں ہے۔ اسے اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حالات اورواقعات کو خالص ادبی انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ عصری تناظر کی رو سے دیکھیں تو آج کی صورتحال انتہائی دشواراور کشیدہ اور پیچیدہ اور بوجھل نظر آتی ہے۔ راہیں مسدود اورماحول سنگلاخ نظر آتا ہے۔ اس تمام مراحل میں قاری کو ادیب کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

ج۔ معاشرہ اور طبقات

معاشرہ افراد کی ایسی جماعت یا گروہ کو کہا جاتا ہے۔ جس کی بنیادی قسم کی ضروریات زندگی میں ایک دوسرے سے مشترکہ روابط موجود ہوں۔ اللہ باری تعالی نے انسانوں کو پیدا کیا تو وہ مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گے۔ یہ انسان آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے لگے تو اس گروہ کا مشترکہ ربط معاشرہ کہلایا۔ جب اس انسانی گروہ کی تعداد بڑھی تو اس میں طبقاتی نظام رائج ہو گیا۔ اس نظام کے تحت معاشرے کے لوگ تین بڑے طبقات میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ بقول علی عباس جلال پوری

> " زرعی انقلاب کے بعد ریاست صورت پذیر ہوئی جس کے ساتھ معاشرہ انسانی مختلف طبقات میں بٹ گیا۔ بادشاہوں اوران کے حاشیہ نشینوں نے اقتدار پر قبضہ جما لیا۔ محنت کش، کاریگر اور کسان ان کے لئے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنے پر مامور ہوئے۔ اس طرح بڑے طبقات معرضِ وجود میں آ گئے "[۲۲]

ہمارا معاشرہ تین طبقات پر مشتمل ہے۔ سب سے بڑا طبقہ اعلیٰ طبقہ / اشرافیہ جس میں جاگیر داراور سرمایہ دار شامل ہیں ۔ متوسط طبقہ / درمیانہ میں نوکری پیشہ افراد چھوٹے زمینداراور تاجر شامل ہیں ۔ نچلہ طبقہ / پسماندہ طبقہ یہ وہ طبقہ ہے جو معاشرے میں سب سے زیادہ پسماندگی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس میں مزارعے، غلام اورمزدور شامل ہیں۔ بقول علی عباس جلالپوری" زرعی انقلاب کے بعد صورت پذیر ہونے والے معاشروں میں دو بڑے طبقات ابھرتے رہے آقا اور غلام، جاگیرار اورمزارعہ یا کھیت

مزدوران طبقات میں صدیوں سے کشمکش جاری ہے۔" (۲۳)صدیوں سے رائج یہ طبقاتی نظام معاشرے میں پسماندگی کا سبب بنتا ہے۔اجتماعی طریقہ پیداوار سے یہ طبقات ختم ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شخصی املاک اجتماعی املاک میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ طبقات کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں چوری چکاری، قتل و غارت، عصمت دری اور لوٹ مار کے واقعات میں اضافہ ہوتا ہے۔طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کے لیے اجتماعی املاک کا نظام رائج کرنا پڑے گا۔ جس سے قدیمی طبقات مٹ جائیں گے اس طرح سب لوگ مساوی طور پر مل کر معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں گیں۔

د۔ پسماندگی

پسماندگی ایک ایسا تصور ہے جس کو کسی ایسی قوم کی حالت یا صورتِ حال کا نام دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں معاشرتی ترقی کی سطح مناسب نہیں سمجھی جاتی ہے۔پس ماندگی کے اثرات زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک پر ہوتا ہے۔ جہاں کے باشندوں کو شدید قسم کی معاشی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ لوگ ایک معیاری زندگی بسر نہیں کر رہے ہوتے۔ان کے بنیادی حقوق روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم اور ملازمت کے مناسب مواقع نہیں مل رہے ہوتے۔ پسماندگی کی دو بڑی وجوہات ہیں جو درج ذیل ہیں۔

- زمینی پسماندگی
- ذہنی پسماندگی

زمینی پسماندگی

اس قسم کی پسماندگی میں انسانی زندگی ذراعت، سڑکیں، رہائش، خوراک اور ماحول سے محروم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علاقوں میں ان تمام مسائل کا سامنا کرتے ہی اپنی زندگی گزار دیتے ہیں ۔جس وجہ سے ان کی نسلیں ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوتی ہیں۔یہی وہ بنیادی پسماندگی ہے جو انسان کو وراثت میں ملی اور اس کے تحت وہ اپنی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔

ذہنی پسماندگی

اس قسم کی پسماندگی میں انسانوں کا وہ طبقہ شامل ہوتا ہے جو مختلف ذہنی اقسام کے تصورات میں جھگڑا ہوتا ہے۔ جس میں تعلیم، ثقافت، ہجرت، رشتے داری اور غلامی وغیرہ شامل ہیں۔اس قسم کی پسماندگی کا سامنا

عام طور پر انفرادی سطح کو ہوتا ہے۔ جس میں قطع ریاست کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ پسماندگی فرد واحد کی خود ساختہ ہے۔ اس کا حل بھی فرد واحد کے توسط سے ہوتا ہے۔ عام طور پر ہمارے ادب میں ان دو اقسام کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں اقسام فرد واحد کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ ان اقسام سے دو چار افراد ہماری فکشن کے ہیرو ہیں۔ جو عصری آگہی کے حوالے سے ہر دور میں نمایاں کام سرانجام دیتے ہیں۔ جن سے لوگوں کے اندر ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک تحریک نئے جذبے سے بیدار ہوتی ہے۔

ہ۔ پسماندگی کے مظاہر

کسی بھی ملک یا ریاست میں بہت سے عوامل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو پسماندہ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ پاکستان بھی ایک ایسا ہی ملک ہے۔ جس کے تقریباً دو تہائی آبادی غربت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگر ان لوگوں کی پسماندگی اور غربت کا جائزہ لیں تو بہت سے عوامل سامنے آتے ہیں ۔ کسی بھی ریاست میں سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیر دارانہ نظام کے مضبوط ہونے سے پسماندگی کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔ فلاحی تنظیمیں آج کل پسماندگی اور غربت کے خاتمے کے لیے دن رات کام کر رہی ہیں لیکن ان کی خطیر رقم ملازمین کی تنخواہوں، تشہیر وغیرہ پر خرچ ہو جاتی ہے۔ جبکہ ۲۵ سے ۳۰ فیصد رقم ہی عوام کی فلاح پر صرف ہوتی ہے۔ حکومتی سطح جائزہ لیں تو حکومت بھی غربت اور پسماندگی کے خاتمے کے لیے اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لا رہی ہے۔ لیکن حکومتی وسائل کو صرف اور صرف حکمران جماعت اپنے لوگوں تک محدود رکھتی ہے۔ جانب دارانہ اور غیر منصفانہ تقسیم کی بدولت ان تمام پالیسیوں کے ثمرات غرباء تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس لیے ریاست میں پسماندگی کے اثرات موجود رہتے ہیں۔ اگر پسماندگی کے اسباب اور محرکات کا جائزہ لیں تو اس قسم کا منظر ہمیں نظر آتا ہے۔

پس ماندگی کی سب سے بڑی وجہ بے روزگاری ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ بے روزگار ہیں کیونکہ سرکاری و غیر سرکاری نوکری کے لیے قابلیت کے ساتھ ساتھ سفارش اور اثر و رسوخ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے بہت سے گھرانے پس ماندگی اور غربت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پسماندگی میں اضافے کی سب

سے بڑی وجہ عمر ہے۔ کم عمر اور عمر رسیدہ افراد کام کاج نہیں کرتے بلکہ اُن کا انحصار کمانے والے پر ہوتا ہے۔ ایک وجہ صنعت اور زراعت میں جدید ترین مشینری کے آجانے سے افرادی قوت کی ضرورت کم ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت سے لوگ پسماندگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صنعتی مشینری کی وجہ سے جہاں پسماندگی کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا ہے وہاں صنعتی انقلاب بھی برپا ہوتا ہے۔ چیزوں کی پیداوار بڑھ جاتی ہے اس کے برعکس مزدوروں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے بارے میں علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں۔ " صنعتی انقلاب کو تاریخِ عالم میں سب سے اہم سنگ میل سمجھا جا سکتا ہے۔ صنعتی انقلاب کے برپا ہونے سے معاشرے میں آہستہ آہستہ نا معلوم طور پر تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔" [۲۴] صنعتی انقلاب سے معاشرے میں نمایاں تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ لوگ بیدار ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہیں روزگار بھی میسر ہو جاتا ہے۔ حقوق کی پامالی کم ہو جاتی ہے۔ بقول علی عباس جلالپوری "صنعتی انقلاب کی بدولت کارخانوں میں لاکھوں مرد عورتیں مل کر کام کرنے لگے۔ صنعتی انقلاب کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عورت صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔" [۲۵] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنعتی انقلاب سے غربت اور پسماندگی میں کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن معاشرے میں طبقات کا وجود قائم ہو جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان کی کل آبادی کا ۳۰ فیصد حصہ چودہ سال سے کم عمر اور ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے افراد پر مشتمل ہے۔ یہ طبقہ دوسروں پر انحصار کرنے کی وجہ سے پسماندگی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تعلیم کے حوالے سے کوئی خاص منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے پسماندہ طبقے کے لوگ بچے کو اس کی دلچسپی کے مطابق تعلیم دلوانے سے نا آشنا ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ طبقہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی پسماندگی کو دور نہیں کر سکتا۔ دستکاریوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ہمارے معاشرے میں تربیت گاہیں کم ہیں۔ جس کی وجہ سے عورتوں کو کارخانوں میں مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی پسماندہ خواتین مردوں کے ساتھ کام کرنا مناسب نہیں سمجھتی اور وہ پسماندہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ان سب مسائل کی وجہ سے پسماندگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

و۔ طبقاتی کشمکش اور جاگیر دارانہ نظام

ہمیشہ سے انسان مختلف خاندانوں قبیلوں اور کنبوں میں منقسم رہے ہیں ۔ طبقات کی تقسیم کاری سے معاشرے میں افراد کی گروہ بندی کی جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں عام طور پر تین بڑے تعلقات پائے جاتے ہیں۔ جن میں اعلیٰ طبقہ / اشرافیہ متوسط طبقہ یا درمیانہ طبقہ کا نچلا طبقہ / پسماندہ طبقہ۔ ان طبقات کی وجہ سے معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن تو ہو گیا لیکن انسانی استحصال میں اضافہ ہو گیا۔ ہر طبقہ دوسرے کے خلاف بغض رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں قتل و غارت اور لوٹ مار جیسے فسادات برپا ہوتے ہیں ۔ معاشرے میں سب سے زیادہ مضبوط اور ستم گر طبقہ اشرافیہ کا ہے۔ اشرافیہ سے مراد سرمایہ دار طبقہ ہے۔ جو دولت کی بنا پر دوسرے لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں ۔زرعی انقلاب کی بدولت اس طبقے نے جنم لیا اور دور حاضر میں مضبوط ترین نیٹ ورک کے ساتھ موجود ہے۔ علی عباس جلالپوری اپنی کتاب تاریخ کا نیا موڑ میں لکھتے ہیں۔

> ”ہمارا مقصد شخصی املاک کو ایک طبقے سے دوسرے میں منتقل کرنا نہیں ہے بلکہ اسے مٹا دینا ہے۔ طبقاتی جدو جہد کو نرم کرنا نہیں بلکہ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھنا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں پیداوار کا واحد مقصد ذاتی نفع کمانا ہے۔“ (۲۶)

> ”فیوڈل ازم کا لفظ فیو(fue)،فیوڈ(fude)یا فیوڈم (feudum)سے نکلا ہے یہ ایک جائیداد کی شکل تھی کہ جس کی ذکر قرونِ وسطیٰ کی قانونی کتابوں میں ہے۔فرانسیسی زبان میں یہ لفظ فیودا لیتے(feodalite) ہو گیااس سے پہلے اس مفہوم کو فیف(feief) کے ذریعہ ادا کیا جاتا تھا۔فیوڈل ازم کی اصطلاح کو بحیثیت معنی وسیع گردانتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی جب ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو" جاگیر داری " کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔“ (۲۷)

جاگیر دارانہ نظام یورپ میں مخصوص سماجی،سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے پیدا ہوا۔یورپ میں ہی مکمل فروغ پایا۔جاگیر دارانہ نظام جس صورتِ حال کے تحت وجود میں آیا تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکل

تبدیل ہوتی رہی بلکہ ضرورت کے تحت وہ نئی نئی روایات اپنے اندر ضم کرتا رہا۔اس لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا۔جاگیر دارانہ نظام کا جائزہ لیں تو اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو نیچے سے ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔اس قسم میں گاؤں کا زمیندار اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے اپنے علاقے میں حکومت قائم کرتا ہے۔ میندار ریاست اوراپنے علاقے کی عوام کے درمیان ایک پل کا کردارادا کرتا ہے۔ کیونکہ کسان زمیندار کا ساتھ دیتاہے۔اس لیے کہ ان دونوں کا براہ راست تعلق ہے۔ بادشاہ اور جاگیر داران کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔

کسانوں سے ٹیکس وصول کرتاہے اور مرکزی حکومت کو ضرورت کے وقت یہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔دوسری قسم وہ ہے جو اوپر سے نافذ ہو مطلب کہ بادشاہ اپنے ماتحتوں پر ٹیکس / خراج عائد کرتا ہے۔اس قسم کے ماتحت اپنے علاقوں میں بااختیار ہوتے ہیں کیونکہ وہ مرکزی حکومت کو ٹیکس ادا وصول کرکے دیتے ہیں۔

برصغیر میں ہمیشہ سے جاگیر دارانہ نظام موجود رہا ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے مسلمانوں کی حکومت اسی زمرے میں آئی تھی۔ وہ لوگ خود کو اعلی طبقہ اور باقی عوام کو نچلہ طبقہ تصور کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی حکومت کا خاتمہ انگریزوں نے نچلے طبقے کے ساتھ مل کر کیا۔جاگیر دارانہ نظام میں ساری دولت مزدور طبقہ حاصل کرتا ہے لیکن اس کا استعمال جاگیر دار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مزدور طبقہ کا استحصال ہوتا ہے اور معاشرے میں نئے جرائم جنم لیتے ہیں ۔مثلاً آقا کا غلام کے ہاتھوں قتل ہونااور مزدوروں کا بغاوت کرنا وغیرہ جیسے واقعات ماضی کے اوراق پر موجودہیں ۔ علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں۔"سلاطین ،امراء اور پردھتوں کا طفیل خو رمقتدر طبقہ اور محنت کش عوام جن کا استحصال وہ کرتے ہیں۔" [۲۸]جب تک معاشرے میں جاگیر داری نظام ختم نہیں ہوتا عوام کا استحصال موجود رہے گا۔ معاشرے میں جرائم پیشہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔

جاگیر داری نظام کی بنیاد برصغیر میں مغلوں کے دور میں رکھی گئی۔اس سے پہلے نظام مغربی ممالک میں قائم تھا۔ علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں۔ " ہندوستان میں مغلوں نے منصب دار نظام جاری کیا۔بادشاھوں، جاگیرداروں، منصب داروں اور پروھتوں کی گرفت عوام پر بڑی مضبوط تھی۔" [۲۹]جب تک معاشرے میں ذات پات ،اونچ نیچ، آقا غلام وغیرہ کا نظام رائج رہے گا معاشرے میں فسادات برپا ہوتے رہیں گے۔ ذات

پات کا نظام برہموں نے قائم کیا۔ " ذات پات کا ادارہ برہموں نے قائم کیا تھا۔ اس لئے اس لیے قدرتاً انہوں نے اپنے آپ کو بلند ترین مقام دیا۔" (۳۰) اس لیے ہندوؤں میں سب سے اونچی ذات برہمنوں کی۔ یہ خود کو اعلیٰ اور دوسروں کو نیچ یا کم تر سمجھتے ہیں۔ اس نظام سے معاشرے میں فسادات برپا ہوتے ہیں۔ لوگ احساس کمتری کا شکار نظر آتے ہیں۔

طبقاتی کشمکش اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی معاشرے میں مساوات کا نظام قائم ہو جائے گا ۔ معاشرہ انسانی حقوق کا علمبر دار بن جائے گا۔ تین طبقات کا فرق ختم ہو جائے گا۔ یہ سب اس وقت ہو گا جب معاشرے میں اشتراکی نظام رائج ہو گا۔ جس کی وجہ سے شخصی املاک کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سے استحصال کا سدِباب کر دیا جائے گا۔ طبقاتی تفریق مٹ جائے گی ۔ زرعی اور صنعتی پیداوار مشترکہ لائحہ عمل سے پروان چڑھے گی۔ معاشرہ مالی بحران سے محفوظ رہے گا ۔ اور سب سے بڑی بات بے روزگاری کا جڑ سے خاتمہ ہو جائے گا۔ افرادِ معاشرہ کی جسمانی، ذوقی اور ذہنی ضروریاتِ زندگی بوجہ احسن پوری کی جائیں گی۔ جس کی وجہ سے اُن کی صلاحیتں معاشرے کی فلاح و بہبود پر وقف ہوں گی۔

ز۔ معاشی بدحالی

ایک مُتحرک سماج کا سارا دارومدا معاش پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ایک منصفانہ معاشی نظام ہی ایک کامیاب معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ معاشی بدحالی سے مرا دانسان کو معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ان تک رسائی نہ ہونا معاشی بدحالی ہے۔ معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے انسان کو تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ اس محنت کے بدلے میں میں انسان اپنی ضروریاتِ زندگی تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔ پہلے زمانے میں چیزوں کے بدلے چیزیں ملتی تھیں اس کے بعد دھاتوں سے تجارت کا آغاز ہوا اوراب پیسوں کی صورت میں ہر چیز میسر آجاتی ہے۔ اب ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معاشرے کے افراد محنت کرتے ہیں بدلے میں انہیں سرمایہ ملتا ہے۔ جس سے وہ اشیائے ضروریہ خرید کر گزر بسر کرتے ہیں۔

معاشی بدحالی کے پھیلاؤ میں حکمران جماعت ،جاگیر داراور سرمایہ داراہم کردارادا کرتے ہیں ۔یہ لوگ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اضافہ اوراجرت میں کمی کر دیتے ہیں ۔جس سے معاشرے میں معاشی بدحالی پھیلتی ہے۔لوگ افلاس و بھوک سے مرنے لگتے ہیں ۔ پھر یہی لوگ انہیں اپنا غلام بنا کر روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض اُن سے جسمانی مشقت لیتے ہیں ۔جس سے معاشرے میں بہت سے جرائم جنم لیتے ہیں ۔ معاشی بدحالی کی وجوہات میں محنت کا کم معاوضہ ، دولت کی غیر مساوی تقسیم اور منافع کی ہوس وغیرہ شامل ہیں ۔ معاشی بدحالی کی بنا پر معاشرہ طبقات میں منقسم ہو جاتا ہے اور یہی طبقات معاشرے کی ترقی میں اہم رکاوٹ بنتے ہیں۔ حکومتی پالیسیوں کو فعال کر کے معاشرے سے اس موذی مرض کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

معاشی بدحالی کی وجہ سے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔لوگ مختلف جرائم و مسائل میں ملوث ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں پسماندگی کی بڑھتی شرح اور معاشی بدحالی سے دوچارافراد کی قومی و نجی سطح پر خدمت کی جاتی ہے تا کہ یہ افراد معاشرے میں باعزت طریقے سے زندگی بسر کر سکیں۔ ان قومی و نجی سطح کے اداروں کے سروے کے دوران راقم الحروف کو ان اداروں کے عہدے داروں نے بہت سے مسائل سے آگاہی دی اوراپنے اداروں کے فعال کردار کی تعریف بھی کی ۔جنوبی پنجاب میں ایک اندازے کے مطابق ۲۰ فیصد لوگ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں ۔ تیس فیصد لوگ غربت کی لکیر سے اوپر زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کا شمار بھی پسماندہ لوگوں میں کیا جاتا ہے۔ جبکہ چالیس لوگوں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور دس فیصد کا تعلق سرمایہ داروں اور جاگیر داروں سے ہے۔ پاکستان کے اس خطے میں جاگیر داری نظام ایک مربوط اور منظم طریقے سے موجود ہے۔جس کے ذریعے اس خطے کی پسماندگی کی شرح میں اضافہ کیا جارہا ہے۔یہاں کے لوگ جہالت اور فرسودہ قسم کی رسم و رواج اور پرانی روایات کی بدولت پسماندگی سے چھٹکاراحاصل کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں پسماندہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سے قومی اور نجی ادارے کام کر رہے ہیں ۔ ان اداروں کا مقصد غربت اور پسے ہوئے طبقے کو اوپر لانا ہے۔ ان کی مالی معاونت کے ساتھ ساتھ انہیں روزگار کے نئے طریقوں سے متعارف کرانا بھی ہے۔ ان اداروں کا مقصد بغیر سود قرضوں کی فراہمی بھی ہے جس سے پسماندہ طبقہ اپنا چھوٹا کاروبار شروع کر کے معاشرے کی ترقی میں اہم کردارادا کرتا ہے۔ ان کی

خصوصی کمیٹیاں سروے کے ذریعے مستحق اور نادارافراد کی نشاندہی کر کے ان افراد کی مالی معاونت کرتی ہے۔ یہ ادارے صرف اور صرف غریب اور مستحق افراد کی امداد پر مامور ہیں۔ جن میں مزدور، غریب کسان، بیوائیں، معذور، اقلیت سے تعلق رکھنے والے افراد، خواجہ سرا اور نادارافرادوغیرہ شامل ہیں۔ ان لوگوں کی معاونت کے بعد اس خطے میں معاشی بدحالی کے خاتمے کے لیے امداد کے بعد بہترین نتائج سامنے آرہے ہیں یہ خدمت / امداد لوگوں کو مختلف جرائم میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔ کیونکہ غریب اور نادار لوگ پیٹ کی خاطر چوری چکاری اور قتل و غارت جیسی سرگرمیوں کا حصہ بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان اداروں کی بدولت معاشرے میں اخوت اور بھائی چارے جیسے نظام کے اثرات نمودار ہو رہے ہیں جو معاشرے لے لیے کوش آئندبات ہے۔ اس سے لوگوں میں خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آبادی اور مہیا کردہ مسائل کے تناسب میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ مقامی افراد کی غربت، زراعت کی پسماندگی، سیلاب اور دیگر موسمی تغیرات کی بدولت گرغربت افلاس دور کرنے کے لیے کئی دہائیاں درکار ہوگی۔ بہر حال کچھ ہونا کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ ان قومی و نجی اداروں کے سروے سے ہمیں دیہی لوگوں کی زندگی اور گزر بسر کے طریقوں سے مکمل آگاہی حاصل ہوئی ہے۔ ان سب افراد کے دکھ درد و کرب ہمیں کے افسانوں میں میں نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے دیہی معاشرت کا قریب سے مشاہدہ کیا ہوا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے دیہی پسماندگی کا شہکار ہیں۔

معاشرہ اوراس کے طبقات کی تقسیم سرمائے کی بدولت وجود میں آتی ہے۔ معاشرے میں طبقات کی وجوہات میں جہالت، غربت، جاگیرداری نظام، جدید صنعتی انقلابات وغیرہ اہم کردارادا کرتے ہیں ۔ اس وجہ سے معاشرے میں پسماندگی کے پھیلاؤ میں خاطرخواہ اضافہ ہوتا ہے۔لوگ غربت و افلاس سے تنگ آکر مختلف قسم کے جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ جس سے معاشرے میں مساوات اور بھائی چارے کے نظام پر منفی اثرات سرزد ہوتے ہیں۔ معاشی بدحالی، سرمایہ دارانہ نظام، جاگیر درانہ نظام، طبقاتی کشمکش وغیرہ نے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان تمام عوامل کی بدولت معاشرے میں پسماندگی جنم لیتی ہے اور مسائل و جرائم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان تمام محرکات کے معاشرے پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۲۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۳۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از گلزار جاوید، ماہنامہ، چہار سو، راولپنڈی، اگست ۲۰۱۴ء، ص ۴
۴۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از ابنِ عاصی، مشمولہ، پولیٹیکل سپن، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۳۹
۵۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۶۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۷۔ ایضاً
۸۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از گلزار جاوید، ماہنامہ، چہار سو، راولپنڈی، اگست ۲۰۱۴ء، ص ۵
۹۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۱۰۔ حنیف باوا، (نٹرویو) گلزار جاوید، ماہنامہ، چہار سو، راولپنڈی، اگست ۲۰۱۴ء، ص ۵
۱۱۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۱۲۔ شفیع ہمدم، پرفیسر، دل دوستاں سلامت، مجید بک ڈپو جھنگ صدر، مارچ ۲۰۰۰ء ص ۸۷
۱۳۔ شفیع ہمدم، پرفیسر، دل دوستاں سلامت، ص ۸۶
۱۴۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۱۵۔ شفیع ہمدم، پرفیسر، دل دوستاں سلامت، مجید بک ڈپو جھنگ صدر، مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۸۷
۱۶۔ شفیع ہمدم، پرفیسر، دل دوستاں سلامت، ص ۹۱
۱۷۔ ایضاً، ص ۸۶
۱۸۔ خیر الدین انصاری، لہکتی ڈال، انصاری پبلی کیشنز، جھنگ، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۶
۱۹۔ بلال زبیری، تاریخ جھنگ، جھنگ ادبی اکیڈمی، جھنگ، ستمبر ۱۹۷۶ء، ص ۴۸۹
۲۰۔ حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن
۲۱۔ انجم نیازی، ایک تنہا آدمی، فیضا الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، یکم جنوری، ۲۰۰۷ء، ص ۱۸۲
۲۲۔ علی عباس جلالپوری، سید، رسومِ اقوام، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۴
۲۳۔ علی عباس جلالپوری، سید، رسومِ اقوام، ص ۱۳۸
۲۴۔ علی عباس جلالپوری، سید، روح عصر، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۹

۲۵۔ علی عباس جلالپوری، سید، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۸

۲۶۔ علی عباس جلالپوری، سید، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۲

۲۷۔ مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر، فکشن ہاؤس کاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹۔۱۵

۲۸۔ علی عباس جلالپوری، سید، رسومِ اقوام، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۴

۲۹۔ علی عباس جلالپوری، سید، رسومِ اقوام، ص ۱۳۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۵

باب دوم:

حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیاں عصری تناظر میں:
تجزیاتی مطالعہ

الف۔ معاشی پسماندگی کی کہانیاں

معاشی پسماندگی پر بات کرنے سے پہلے معیشت کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ معیشت کا مطلب روزگار، روزی یا زندگی وغیرہ کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جو کام کاج کرتا ہے۔ وہ اس کا ذریعہ معاش کہلاتا ہے۔ اگر معاش کی تعریف کا جائزہ لیں تو" فیروزاللغات میں معاش سے مراد "وہ شے جس سے بسر اوقات کی جائے"[۱] اس کے ساتھ اگر معاشی کا لغوی معنی دیکھیں تو اس سے مراد "روزی اور بسر اوقات کے متعلق "[۲]۔ انسان خواہشات کا پتلا ہے۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی خواہشات کا جنم ہو جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو ابتداء میں انسان کی خواہشات سادہ یا عام قسم کی ہوتی ہیں۔ جن سے وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھتا ہے۔ پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خواہشات میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جس سے انسانی زندگی کے گرد ایک معاشی چکر چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ معاشی چکر انسانی زندگی کے ساتھ ہی چلتا ہے۔ جو مرنے پر ختم ہو جاتا ہے۔ انسان جس معاشی چکر میں داخل ہوتا ہے۔ اس دائرے میں رہ کر انسان اپنی خواہشات یا حاجات کو پورا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے۔ محنت سے مراد ذہنی کاوش یا جسمانی مشقت ہوتا ہے۔ محنت کا معاوضہ انسان دولت کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ اس دولت سے انسان اپنی خواہشات اور حاجات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک خواہش پوری ہونے پر دوسری جنم لیتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔ جو انسان کے مرنے تک جاری رہتا ہے۔

۱۔ معاشی پسماندگی

اس معاشرے میں انسان کی زندگی کا بسر اوقات اس کے ذریعہ معاش کے ساتھ ہے۔ اگر وہ محنت کرتا ہے اور سرمایہ کماتا ہے تو اچھی زندگی بسر کرے گا۔ معاشی پسماندگی سے مراد انسان کا ذریعہ معاش کا کم ہونا یا زندگی بسر کرنے کے لئے جو چیزیں درکار ہیں وہ اس کی پہنچ سے دور ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں معاشی پسماندگی کا بحران آجاتا ہے۔ اس سے انسان مفلوک الحالی والی زندگی گزارتا ہے۔

۲۔ معاشی پسماندگی کی وجوہات

کسی بھی ریاست یا ملک میں معاشی پسماندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب مرکزی منصوبہ بندی نہ کی جائے اور مکمل مقابلے کی وجہ سے معیشت میں افراطِ زر کا مسئلہ اور کبھی معاشی بحران کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ معاشی پسماندگی کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔

دولت کی غیر مساوی تقسیم

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے معاشی پسماندگی پیدا ہوتی ہے۔ جس سے معاشرہ مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ معاشی ب پسماندگی کا شکار طبقہ حسد، بغض، بدامنی، اور قتل و غارت جیسی سماجی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس سے ملک میں انتشار کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

منافع کی ہوس

معاشرے میں ہمیشہ سرمایہ دار طبقہ منافع کی تلاش میں رہتا ہے۔ کیونکہ معاشرے میں سرمایہ دار وہی کارخانے یا کام کرے گا جس سے اس کو زیادہ سرمایہ حاصل ہو۔ اس طرح معاشرے کے بہت سے لوگ بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

محنت کا معاوضہ کم

معاشرے میں ہمیشہ سرمایہ داروں کی حکومت رہی ہے۔ جس کی وجہ سے مزدور کو پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ دیکھا جائے تو مزدور کماتا ہے اور سرمایہ دار بیٹھ کر کھاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں طبقاتی نظام کی مضبوط جڑیں تن آور درخت کی شکل اختیار کرلیتی ہیں ۔ اس طرح کی بہت سی وجوہات ہیں ۔ جن سے معاشرے میں معاشی بدحالی پیدا ہوتی ہے۔ معاشی پسماندگی سے بچنے کے لئے معاشرے میں طبقاتی نظام کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہئے۔ اس طرح ملک معاشی پسماندگی کے بحران سے بچے گا اور مزدور طبقے کا استحصال ختم ہو جائے گا۔

اُن کے اردو افسانوں میں معاشی پسماندگی کی بہت سی کہانیاں موجود ہیں۔ جن کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن نے معاشی پسماندگی کے بحران کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس معاشی بحران کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ معاشی پسماندگی اور دیہی زندگی کے المیوں کی پیش کش اردو افسانے کے پہلے دور میں ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر افسانے میں دیہی زندگی کے المیوں کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> " دیوند ستیارتھی نے اپنے افسانوں کی اساس دیہی لوگوں پر رکھی۔ جب کہ ندیم نے گاؤں کے پس منظر میں انسانی زندگی کے ان المیوں کو اجاگر کیا جن کا تعلق جذباتی ناآسودگیوں سے کم اور معاشی عدم مساوات سے زیادہ ہے۔"(۳)

اُن کے ان افسانوں کا تجزیہ کرتے ہیں جن میں انہوں نے معاشی پسماندگی کی نشاندہی کی ہے۔ حنیف باوا اپنے افسانے "دو ڈُبڈبائی آنکھیں" میں معاشی پسماندگی کی عکاسی / نشاندہی اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس افسانے کو اپنی کہانی سمجھتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کرتے ہیں جو اپنی معاشی حالت بہتر کرنے اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی بیوی کی ادھوری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بیرون ملک کا سفر کرتا ہے۔ اس کے بارے میں حنیف باوا یوں لکھتے ہیں:

> "یہ اس ننھی منی رضیہ کی ماں ہے۔ اس کی حیاتِ شریک۔ یہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو سونے چاندی سے منقش کروانا چاہتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی اس چھوٹی سی بستی کے غریب

باسیوں کی آنکھوں میں اپنے ان سنہری ہاتھوں سے چکا چوند پیدا کر سکے۔ دیکھئے اس کے ہاتھ بھی سب سے نمایاں ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔"(۴)

اس افسانے میں انسانی خواہشات ہی ایک زندگی کو نگل لیتی ہیں۔ لیکن پورا ہونے کا نام ہی نہیں لیتں۔ ایک سے بڑھ کر ایک پیدا ہو رہی ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں میں معاشی بدحالی انسانی جذبات کو ختم کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہے۔ انہوں نے ذریعہ معاش کے نا ہوتے ہوئے اپنے کرداروں کو حوصلہ اور ہمت دی ہے۔ جس کی بہترین مثال "دروازہ کھلا ہے" میں ہے۔ اس میں ایک مفلوک الحال ادیب کی کہانی ہے۔ جو ذریعہ معاش کے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کچھ اس طرح کرتا ہے:

""میں اپنے اس پرانے مکان کے خستہ حال کمرے میں رہتا تھا۔ یہی میرے سونے کا کمرہ تھا۔ یہی بیٹھک تھی۔ یہی دارالمطالعہ جس میں دو بڑی الماریاں تھیں۔ جو سدا خوبصورت کتابوں سے بھری رہتی تھیں۔ جو کتابیں میرے مطالعے میں رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس ٹوٹی ہوئی میز پر پڑی رہتی تھیں۔"(۵)

ادیب جب تک کہانی میں اپنی ذاتی زندگی کے تجربات شامل نہیں کرے گا اس وقت تک کہانی کسی کی ترجمانی نہیں کرے گی بلکہ ایک انوکھی چیز ہی رہے گی۔ اُنہوں نے معاشی پسماندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا اور ان کو اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ اس سلسلے میں عامر عبداللہ مضمون "تنہائیوں کے درمیاں" میں رقمطراز ہیں۔ "اُس کے افسانے انسان دوستی کی مثال پیش کرتے ہیں اور انسان کے ازلی دکھوں کی داستان کہتے ہیں۔"(٦)" دوزدہ آدمی" میں وہ ایک بوڑھے شخص کی معاشی حالت بیان کرتے ہیں۔ جو مرتے دم تک ذریعہ معاش کی تلاش میں رہا اور سسک سسک کر جان دے دی:

"بابا کرم الٰہی گھاس کی گٹھڑی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ پاؤں میں اُدھڑے ہوئے چھتر تھے جو اس کے سوکھے پاؤں کی پکڑ میں آنے سے گریزاں تھے۔ اس نے کمر پر ایک چھوٹا سا ڈوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ اس کا بھی اس نے لانگڑ مار رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی منحنی سی ٹانگیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے دائیں ہاتھ میں

ایک پتلی سی سوٹی پکڑ رکھی تھی۔ وہ اس کی ٹانگوں کی طرح ٹیڑھی میڑھی سی تھی۔ وہ قدم اٹھاتے وقت اس چھڑی کا سہارا لے لیتا تھا"۔(۷)

اُن کے کردار معاشی پسماندگی کے باوجود حالات سے لڑتے ہیں اوراپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے محنت جاری رکھتے ہیں۔ اس افسانے کا کردار بھی ہمت اور حوصلے کی علامت بن کر ہمیں آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ باوا کے افسانوں میں معاشی مسائل سے گھرا ہوا کردار نظر آتا ہے۔ لیکن وہ ان نامساعد حالات کے سامنے ہار نہیں مانتا بلکہ اس کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اوران حالات کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ "سسکتی زندگی" میں حنیف باوانے ایسے ہی ایک کردار کو معاشی حالات سے لڑتے ہوئے عکس بند کیا ہے۔ جو اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کا جسم اب بھوک برداشت نہیں کر سکتا جس سے اس نے حالات سے جنگ جاری رکھنی ہے:

" جب وہ اس شخص کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے کمبل کا ایک کونہ پکڑ لیا اور کاغذ اس کے آگے کرنے کی کوشش کی پر وہ کمبل کو ایک جھٹکے سے چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اسے وہاں سوائے پسلیوں اورانتڑیوں کے کچھ نہ ملا۔اس نے جیب سے وہی پانچ آنے نکالے اور نظریں اوپر اٹھا کر سامنے تپتے ہوئے تنور کی اور دیکھا جہاں چند لمحے پہلے باؤ بیٹھا تھا۔ایک پل کے لیے اس کے بجھے بجھے سے چہرے پر رونق آگئی۔"(۸)

معاشی حالات ابتر ہوں تو انسان نفسیاتی مسائل میں الجھ جاتا ہے۔ لیکن حنیف باوا کے افسانوں کے کردار پھر بھی ان حالات کا سامنا نارمل حالت میں ہی کرتے ہیں اور نامساعد حالات میں خوش رہنے کا سبق دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں ان کرداروں کا ذکر کیا ہے۔ جو جدید دور میں ناپید ہو چکے ہیں۔ ان کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے۔ "گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" کا معاشی حوالے سے جائزہ لیں تو اس میں بابا مولے کے کردار کے ذریعہ وہ معاشی حالات کی نشاندہی کرتے ہیں:

"ہمیں تو چاہیے کہ ہم مولے کو اس کی لاٹھی اور گھنٹی کو نظر بھر کر دیکھتے رہیں اوراس کے ننگے پاؤں کو اپنی سوچ کا حصہ بناتے رہیں یا پھر اس سڑک کو تکتے رہیں جسے مولا

کے پاؤں او جھلساتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ جس پر بندے تو کیا کوئی پنچھی بھی
اپنا قدم نہیں ٹکا سکتا۔ بابا مولے کا دھیان جب اپنی خالی جیب تک جاتا ہے تو اس وقت نہ
وہ تپتی سڑک کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی ان پیڑوں کی طرف دھیان دیتا ہے۔"[۹]

باوا جن کرداروں کے ذریعۂ معاشی بدحالی پر بات کرتے ہیں۔ ان کرداروں کو نہ تو سرمایہ جمع کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی فضول خرچی کی بلکہ ان کو تو اپنے اور اپنے بچوں کی بھوک کو ختم کرنا ہے۔ جس سے ان کی نسلِ انسانی باقی رہ جائے۔ "دائرہ میں گھرے لوگ" اس افسانے میں حنیف باوا ایسے بچے کی معاشی حالت بیان کرتے ہیں جس کو ابھی کھیلنا تھا۔ بارہ سال کا بچہ بچپن ہی سے معاشی پسماندگی کا شکار ہو جاتا ہے اور پورے خاندان کا ذریعہ روزگار اس سے وابستہ ہے۔ اس عمر میں بچے کے ہاتھ پھول اور اس کے پاس کتابیں خوشبو جیسی ہوتی ہیں۔ لیکن معاشی پسماندگی نے اُن ہاتھوں میں ریڑھی تھما دی ہے۔ جس کو سارا سارا دن دھکیل کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی خوشی اور غمی مال بکنے پر منحصر ہے "جس دن اس کی ساری قلفیاں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہوں گی تو وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا ہو گا۔۔۔۔ اس جیسے لوگوں کی خوشیاں اور غمیاں صرف ایک پیسے کے سکے کے گرد گھومتی ہیں۔"[۱۰] اُنہوں نے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں جن کو معاشرے میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ انسان دوست ہونے کا ثبوت اُنہوں نے ان کے دکھ، درد کو بیان کر کے دیا ہے۔ معاشی بدحالی میں والدین کا پیار بھی مفت حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بچوں کو جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ جس کی بہترین مثال یہ ہے:

"جب وہ قلفیاں بیچ کر گھر لوٹتا ہو گا اس کے والدین اس پر پیار نچھاور کرنے کی بجائے
اس کی جیب پر ٹوٹ پڑتے ہوں گے۔ جب کبھی اس کی جیب ان کی ضرورتوں کی تکمیل
کرتی نظر نہ آتی ہو گی تو وہ انہیں ایسے پیڑ کی مانند نظر آنے لگتا ہو گا جس کا پھل
زہر سے بھی کڑوا ہو۔"[۱۱]

معاشی حالت ابتر ہو تو خوشیوں اور غموں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسان مشین کا کام کرتا ہے۔ کیوں کہ جن کے معاشی حالات اچھے نہ ہوں لوگ ان کے بارے میں جاننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ گلزار جاوید کو ایک انٹرویو میں انسانی دکھ کے بارے میں کہتے ہیں۔"

ابتداء میں انسان دکھوں کی آماج گاہ ہی تو رہا ہے۔ فلسفہ، منطق اور دیگر علوم آدمی کو انسان بنانے کی تگ و دو میں جہاں تک بھی پہنچے ہیں۔ ایک بات واضح ہے کہ دکھ کا مداوانہ ہوا۔"(۱۲)"نہر کی پٹڑی" اس افسانے میں ایک مزدور کی معاشی حالت کے بارے میں بتایا ہے کہ کس طرح بھٹے پر کام کرنے والوں پر غربت کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ خون اور پسینہ بہانے کے باوجود وہ اپنی معاشی حالت بہتر نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کے نزدیک فطرت اور آس پاس کی چیزوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ ان کو ہر وقت اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لالے پڑے ہوتے ہیں۔ آس پاس کے ماحول اور مزدور کے خیالات کے بارے میں حنیف باوا لکھتے ہیں:

> "ان پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں نے پٹڑی کو بھی خوشگوار بنا دیا تھا. بندر بھدکتے چھلانگیں لگاتے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ لیکن وہ اس خوشگوار اور سکون بخش ماحول میں بھی اپنے آپ کو دکھ میں محسوس کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گاؤں سے دس بارہ میل دور بھٹے پر کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ لیکن وہاں سے کوئی کام نہیں ملا وہ مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کی جیب اور پیٹ دونوں خالی تھے۔"(۱۳)

اُنہوں نے اپنی تحریروں میں ان لوگوں کی معاشی حالت بیان کرتے ہیں جن کو زیادہ تر لوگ معاشرے میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے کچے مکان اور پختہ ارادے ہی اس سفر میں ان کے ہمسفر ہوتے ہیں۔ اس افسانے کا کردار جب گھر سے نکلا تو بہت سے خواب اس کے ہمسفر تھے۔ جن کو پورا کرنے کے لئے اس نے پیدل سفر کیا اور بغیر مزدوری کے گھر جاتے وقت اس کی حالت اس جواری کی طرح تھی جو جوئے میں سب کچھ لٹا کر آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ بھٹے کے مزدور کے ساتھ جو خواہشات گھر سے نکلی تھیں۔ اس کی عکاسی حنیف باوا نے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "جب اس نے گاؤں کی دائیں طرف کا موڑ عبور کر کے اپنے مکان کے صحن میں قدم رکھا تو اس کے بچے اس کی طرف لپک پڑے۔
>
> "ابا! میرے لیے لڈو نہیں لایا"؟

"میرے لئے برفی۔۔۔۔۔"

"میرے لیے چھوٹی سی گڑیا کیوں نہیں لائے؟"(۱۴)

اس افسانے میں وہ اسے باپ کی معاشی پسماندگی کی حالت بیان کرتے ہیں جس کو اپنا پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی ننھی منھی خواہشات کو پورا کرنا ہے۔ جو اس کا مستقبل ہیں۔ "گھاس کی گٹھڑی" ایسی عورت کی معاشی حالت ظاہر کی ہے جو اپنے بچپن سے بڑھاپے تک تمام خواہشات کو پسِ پردہ رکھ کر معاشی حالت کو بہتر بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ حنیف باوا مائی پھجاں کی معاشی بدحالی کی نشاندہی یوں کرتے ہیں۔"مائی پھجاں ٹانگوں والے اڈے پر گھاس فروخت کر کے جو پیسے وصول کرتی ہے وہ انہیں اپنی پھٹی پرانی چادر میں پانچ سات گرہیں دے کر ایسے باندھتی ہے جیسے اسے ان پیسوں کا اڑ جانے کا خدشہ ہو۔"(۱۵) مائی پھجاں کی ساری زندگی اسی گھاس کی گٹھڑی کے سہارے گزری ہے۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکل کر گھاس تلاش کر کے کاٹتی ہے اور اسے پاس ہی گھوڑوں کے اڈے پر بیچتی ہے۔ موسم کے بدلتے ہوئے رنگ اس کے زندگی پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ ایک دن بارش کی وجہ سے وہ کس طرح پریشان ہوتی ہے حنیف باوا یوں رقمطراز ہیں:

"بارش مزید کتنی دیر برستی۔ آخر اس نے رُکنا تھا اور رُک گئی۔ مائی پھجاں کی گٹھڑی بھیگ گئی اس بھیگی ہوئی گھاس کو دیکھ کر اس کا دل غمگین ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ سوچتی ہے کہ شاید اب گھاس نہ بک سکے گی۔"(۱۶)

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہمیں اُن کے افسانوں میں ملتی ہیں۔ جن میں کردار اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے سامان کو محفوظ رکھتا ہے۔ جس سے اس کے چولہے کی آگ نے جلنا ہے اور ان کے پیٹ کو بھرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس کی ایک بہترین مثال ان کے افسانے "سوکھے پتے" میں ہے۔ سگو غریب گھرانے کی لڑکی ہے جس کو اپنا چولہا جلانے کے لیے سوکھے پتے اکٹھے کرنے ہوتے ہیں۔ ایک دن بارش کی وجہ سے پیدا ہونے والا منظر حنیف باوا اس طرح عکس بند کرتے ہیں:

"سگو کی ماں! بیٹی ابھی تک نہیں آئی۔ بارش ہونے والی ہے"

ہاں! میرا دل بھی بیٹھ رہا ہے سگو کے ابا۔ پتا نہیں میری بیٹی کس حال میں ہو گی میرا بس چلے تو میں بچی کو اس سردی میں کبھی باہر نہ بھیجوں"

"ہاں! میرا بس چلے تو میں بھی نہ جانے دوں۔ لیکن سگی کی ماں۔ اس کم بخت چولہے کا کیا کریں۔"(۱۷)

"سارنگی والا" کا کردار معاشی بدحالی کے باوجود لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے دکھوں کو کم کرنے اور انہیں راحت بخشنے کے لیے باجا بجاتا ہے۔ باجے کی دھن سے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑتی ہے تو وہ اپنے دکھ بھول کر اس کے دکھ سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو وہ اپنی مختلف دھنوں سے لوگوں کو سنا رہا ہوتا ہے۔ حنیف باوانے اس کا قصہ ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:

"اس کے یہ ترس آمیز الفاظ سن کر لوگ فوراً اس کی موسیقی کے سحر سے باہر نکل آتے اور اپنی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر چھوٹے بڑے سکے پھینکنے لگتے۔ دن ڈھلنے کے بعد جب گھر لوٹتا تو اتنے کم پیسوں کو دیکھ کر اس کی بیوی کا چہرہ لٹک سا جاتا۔ بھلا وہ اتنے کم پیسوں سے گھر کا نظام کیسے چلا سکتی تھی۔"(۱۸)

"روشنیوں سے اس طرف" معاشی بدحالی کا شہکار افسانہ ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ انہوں نے معاشی پسماندگی کے ساتھ ساتھ خوشحالی کو بھی بیان کیا ہے۔ "روشنیوں سے اس طرف" میں ایک ایسی تقریب کا منظر پیش کیا جہاں روشنیوں کی بہتات ہے۔ ہر کردار ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت منظر پیش کر رہا ہے۔ کچھ عورتیں سجی ہوئی دلہنوں سے کم نہیں لگ رہیں، اور کچھ نے پرانا لباس زیبِ تن کیا ہوا ہے۔ ان پسماندہ عورتوں کی خواہشات اور معاشی آسودگی ہی ان کو جرائم کی طرف مائل کرتی ہے۔ علی عباس جلال پوری طبقاتی تفریق اور معاشی بدحالی سے دوچار معاشرے کی خواتین کی خواہشات کے بارے میں اپنی کتاب "جنسیاتی مطالعے" میں لکھتے ہیں۔ "جو معاشرہ طبقاتی تفریق پر مبنی ہو اس کی نادار عورتیں امراء کی عورتوں کو رشک اور حسرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ان جیسا سامانِ آرائش، قیمتی ملبوسات اور زیورات فراہم کرنے کے لئے بعض اوقات عصمت فروشی کا دھندہ کرنے لگتی ہیں۔۱۹" اشرافیہ کی عورتیں کو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ

کھانے پینے کا سلیقہ بھی ہے لیکن کھانے کا ضیاء بھی کرتے ہیں۔ بچے ہوئے کھانے کی تلاش میں آئی ہوئی خاتون کا انداز کچھ اس طرح کا ہے:

> "اس نے ڈھیلا ڈھالا لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا جو اس کا اپنا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تو ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی موٹی عورت نے اسے اللہ کے نام پر دے دیا ہو۔ یہ لباس کی جگہوں سے پھٹا ہوا تھا۔ اب وہ ان جھوٹی پلیٹوں کے پاس بیٹھ گئی اور بلا توقف سب کے رد کیے ہوئے کھانے کو سمیٹنا شروع کر دیا۔"[۲۰]

اس طرح کی اور مثالوں میں حنیف باوا معاشی بدحالی کی عکاسی کرتے ہیں اور غریبوں کی حالتِ زار پر کھل کر لکھتے ہیں ۔ جیسے ان کے افسانے "کرم دین گم ہو گیا" میں ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے ایسے باپ کی حالتِ زار بیان کی جو محنت کر کے اپنے بیٹے کو پڑھانا چاہتا ہے۔ جب اسکول کی فیس کا سنتا ہے تو حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اس باپ کی معاشی حالت اور اپنے بچے کے مستقبل کے بارے میں حنیف باوا کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ "پچاس کا نام سن کر اس کا چہرہ جیسے اتر سا گیا۔" استاد جی پچاس تو بہت زیادہ ہیں۔ میں غریب آدمی ہوں کچھ رعایت کر دیں۔"[۲۱] اس افسانے میں حنیف باوا نے مستقبل کے معمار کی بات کی ہے۔ اس کا باپ کس طرح کسمپرسی کی زندگی بسر کر کے اس کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ معاشرے میں زندگی گزارنے کے لیے تعلیم کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس افسانے "کرم دی گم ہو گیا" میں مستقبل کے بارے میں بات کی گئی ہے تو ایک اور افسانے "آس کی لرزتی لو" میں حال پر بات کرتے ہوئے باوا معاشی بدحالی کا شکار ماں باپ کی عکاسی کرتے ہیں۔ دنیا میں رہ کر پیٹ بھرنے کی فکر اور مر جانے کے بعد جسم ڈھانپنے کی فکر کس طرح سے غریب طبقے کا معاشی استحصال کرتی ہے۔ "آس کی لرزتی لو" میں مصنف کس طرح ایک فوت ہونے والی عورت کی میت کا منظر پیش کرتے ہیں۔

> "وہ چارپائی پر جس پر اس کا مردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ وہ موٹے بان سے بنی ہوئی تھی۔ جس پر میل کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ------ جب میت کے نہلانے کی تمام امیدیں دم توڑ چکی تھیں تو اچانک ادھیڑ عمر کا ایک شخص صحن میں داخل ہوا۔------

اس نے ہلکی اور باریک چادر کی بکل سے ایک پوٹلی نکالی اور پاس بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کو تھمادی "اماں جی اب میت جلد اٹھنی چاہیے۔"[۲۲]

اُنہوں نے اپنی تحریروں میں حال ،ماضی اور مستقبل کے حوالے سے انسانوں کی معاشی پسماندگی کی حالت پر بات کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال "کرم دی گم ہوگیا" ہے جس میں مستقبل اور "آس کی لرزتی لو" میں حال پر بات کی ہے۔ جس طرح سے انسان زندگی بسر کرتے ہیں اور مرتے دم تک ان کی کیا خواہشات ہیں ان کو حنیف باوا اپنی تحریروں میں اجاگر کرتے ہیں ۔ باوا اپنے افسانوں میں عام انسانوں کی حالتِ زار کو منظر عام پر لاتے ہیں ۔ حنیف باوانے عام کردار یعنی موچی، خوانچہ فروش، لکڑ ہارا وغیرہ جیسے لوگوں کی معاشی پسماندگی کی عکاسی بیان کرتے ہیں۔

ان کے ایک افسانے "موچی بابا" میں انہوں نے مسلمانوں کے ایک ایسے تہوار کی بات کی جب ہر گھر میں خوشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن معاشی بدحالی کا شکار لوگوں پر جو گزرتی ہے وہ کوئی اور نہیں جانتا۔ عید سے چند دن پہلے کا منظر اور موچی بابا کی امیدوں کو اُنہوں نے اپنے افسانے "موچی بابا" میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں ۔"موچی بابا اب سامنے سے نظریں ہٹائیں اور پاس پڑی ہوئی چنگیر پر مرکوز کردیں۔ چنگیر میں ایک عدد باسی روٹی اور ایک عدد پیاز تھا۔ پھر سامنے والی گلی کی طرح پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔"[۲۳] حنیف باوا جن لوگوں کی معاشی بدحالی بیان کی ان کو دولت چاہیے بھی تو صرف اور صرف پیٹ کی بھوک ختم کرنے کے لیے۔ ان کو محل، سونا، چاندی اور بڑی گاڑی کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے تو ایک وقت کا کھانا ان سب چیزوں سے بہتر دولت ہے۔ افسانہ "سائیکس غلام" میں انہوں نے ایسے ہی شخص کی کہانی بیان کی ہے جو روٹی کے چند ٹکڑوں کے لیے چوری کرتا ہے۔ معاشی بدحالی اور طبقاتی تفریق ہی معاشرے کے افراد کو جرائم کی طرف مائل کرتی ہے۔ علی عباس جلالپوری معاشی پسماندگی کا شکار ممالک میں جرائم کے محرکات کو کچھ اس طرح ہیں۔ بقول علی عباس جلال پوری:

"جرائم کے محرکات میں لالچ، حسد، انتقام، اُکتاہٹ، جذبہ قومیت اور بغیر محنت کے امیر بن جانے کی خواہش ۔۔۔ جرائم اس معاشرے میں پنپتے ہیں جن میں

امارات افلاس کا تضاد نمایاں طور پر موجود ہو۔ اس معاشرے میں دولت عزت اور وقار کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس لیے ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد از جلد بڑے سے بڑا امیر بن جائے"۔ (۲۴)

اُن کے یہاں ہمیں وہ تمام محرکات ملتے ہیں جن سے معاشرے میں جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ یہ محرکات زیادہ تر نجی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ "سائیکس غلام" انتقام و افلاس کے محرک پر مبنی ہے۔ غلام اپنے آقا سے بدلہ لینے اور اپنی بھوک کو مٹانے کے لیے آقا کے گھر چوری کرتا ہے۔ چوری کا منظر کو کچھ یوں ہے:

"آخر وہ وقت بھی آجاتا ہے۔ جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ پہلے وہ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر وہ جلدی سے مکان کی بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سونے چاندی کے زیور کسی کپڑے لتے کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں کو سمیٹتا ہے اور اپنے پلو میں باندھ لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے باہر جا کر ان کھانے پینے کی چیزوں کو اپنے ساتھیوں میں تقسیم کروں گا۔"(۲۵)

دیکھا جائے تو "موچی بابا" اور "سائیکس غلام" کی کہانی ایسے کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن کو کسی محل، زیور، کپڑے گاڑی یا دنیاوی چیزوں کا لالچ نہیں۔ صرف اور صرف ان کرداروں کو اپنی اور بچوں کی بھوک کا خیال ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے وہ چوری بھی کرتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالوں سے حنیف باوا معاشی پسماندگی کو بیان کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسماندہ طبقہ اپنی بقاء کے لئے ہر وقت پریشان ہوتا ہے۔ اُنہوں نے جہاں اپنی تحریروں میں معاشی پسماندگی کا شکار لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ایسے لوگوں کو دکھانے کی کوشش کی جو مالدار تو ہیں لیکن خدا ترس بھی ہیں۔ اُن کے کردار سفید پوش طبقے کی طرح خوددار ہیں۔ وہ کام کر کے ہی روزی کمانا چاہتے ہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتے۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو انکی مدد اُن سے سامان خرید کر کرتے ہیں۔ جس سے دونوں کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حنیف باوا لکھتے ہیں:

"نہیں صاحب ہفتے میں دو تین بار آتے ہیں اور جوتے مرمت کروا کے چلے جاتے ہیں ۔ گو وہ جوتے اتنے پرانے نہیں ہوتے تاہم وہ متعدد جگہوں سے اکھڑے ہوئے ضرور ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی جوتے کو بار بار مرمت کرواتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میں حیران تو ضرور ہوتا ہوں لیکن میرا کام تو جوتے مرمت کرنا ہے۔ ان کے بارے میں سوچنا نہیں لیکن صاحب وہ ہیں بہت اچھے۔"(۲۶)

اس طرح کی اور مثالوں سے حنیف باوا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح معاشی بدحالی کے شکار انسان کی مدد کرنے سے ان کو کتنی خوشی محسوس ہوتی ہے اس کا نعم البدل نہیں ہوتا۔"تِپ تِپ گرتے آنسو" میں اُنہوں نے ایسے ہی منظر پیش کرتے ہیں۔ جس سے معاشی پسماندگی کا شکار بچے نئے کپڑے دیکھ کر سونا ہی بھول جاتے ہیں۔ رات بھر ان کو خوابوں میں وہی کپڑے نظر آتے ہیں جو کسی نے انہیں تحفے میں دیے تھے۔ اس خوشی کے بارے میں باوا یوں رقمطراز ہیں:

"کرملی کے اس بچی کی علاوہ چار بچے اور تھے۔ نوزائیدہ بچی کے چلانے سے وہ بیدار ہو گئے۔ جب ان کی نظر مہمانوں کے قیمتی کپڑوں پر پڑی تو وہ انہیں دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہوں نے بھلا کب ایسے کپڑے دیکھے تھے۔ ان کے نصیب میں تو بڑے لوگوں کی اترن تھی۔۔۔۔۔۔ کرملی نے بچوں کی للچائی نظروں کو بھانپ لیا تھا۔ بچے اپنی چارپائی پر تو چلے گئے لیکن ان کا دھیان مہمانوں کے کپڑوں پر ہی مرکوز رہا۔"(۲۷)

اُنہوں نے اپنی تحریروں میں ایسے ماں باپ کا ذکر کرتے ہیں. جو اپنی خواہشات کو کوپس پردہ رکھ کر اپنے بچوں کو بڑا کرنے کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان ماں باپ کی ساری امیدیں ان پر ہی ہیں کہ وہ بڑے ہو کر ان کی معاشی حالت کو بہتر کریں گیں۔ "لبڑی کولی" میں حنیف باوا ایک ایسی ہی ماں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو خود بھوکی رہ کر اپنے بچوں کو کھانا کھلا رہی ہے۔ اس ماں کی ممتا کو باوا کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں۔ "اس وقت ماں نے خود کچھ کھایا پیا بھی ہو گا یا پھر اپنے بھوکے پیٹ کی پرواہ کیے بغیر وہ تمام کچھ بچوں کے منہ میں ڈال رہی ہو۔"(۲۸)
حنیف باوا نے جو معاشی پسماندگی کا شکار کردار پیش کیے ہیں ان میں احساسات و جذبات بھی پیدا کیے ہیں ۔ انہوں نے اس طرح ان کی عکاسی کی جیسے ہم دیکھ رہے ہوں ۔ ماں باپ کا اپنے منہ کا لقمہ اولاد کے منہ میں

دینے کسی قربانی سے کم نہیں ۔ وہ اپنی خواہشات و جذبات کو پسِ پشت ڈال کر بچوں کی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

"دو خالی ہاتھ" میں حنیف باوا ایسے خوانچہ فروش والدین کی عکاسی کرتے ہیں۔ جو عید جیسے تہوار پر سب کچھ بھول کر اپنا چولہا جلانے کی خاطر عید گاہ کے باہر اپنا سامان فروخت کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں حنیف باوا اس طرح لکھتے ہیں ۔"اگر وہ عید کے روز بھی چھٹی کر لیتے تو شاید ان کے چولہے نہ جلتے وہ اپنے اپنے سودے کو فروخت کرنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔"[۲۹] کیونکہ اُن نے ہاں معاشی پسماندگی سے پریشان لوگوں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دیتے۔ اس لئے باوا کی زیادہ تر کہانیاں پسماندگی کا منظر پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ باوا کی کہانیوں میں جو پسماندہ کردار پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں احساسات و جذبات بھی شدت سے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر پسماندہ کردار سخی دل کا مالک ہے۔ والدین بچوں کی خواہشات کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔ والدین کی قربانی کا بہترین منظر "گستاخ" میں حنیف باوا نے اس طرح پیش کرتے ہیں:

"ایک نوجوان بڑھیا کو ہر روز صبح سویرے گاؤں کی بیرونی سڑک کے بارونق چوک پر چھوڑ جاتا ہے اور شام کو سورج غروب ہونے کو ہوتا تو بڑھیا کو اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑتا۔ سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا اپنا دایاں ہاتھ آگے کو پھیلا کر خاموش بیٹھی رہتی اور اس کی غمزدہ آنکھیں دور خلا میں گھورتی رہتیں اور اس کے لب ہمیشہ سلے رہتے۔ کوئی آتا اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر کوئی بھاری یا ہلکا سکہ رکھ جاتا۔۔۔ جب تک وہ بیٹھی رہتی سکے اس کی مرجھائی ہوئی ہتھیلی پر پڑے اونگھتے رہتے۔"[۳۰]

وہ صرف معاشی حالتِ زار پر بات نہیں کرتے بلکہ انہوں نے ہر کردار کی عکاسی بھی اسی طرح کی جس طرح عام طور پر پسماندہ طبقے کے لوگ زندگی بسر کرتے ہیں ۔ انہوں نے نے افلاس و بھوک کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن کے طریقے پر بھی بات کی اور معاشی پسماندگی میں پسے ہوئے لوگوں کے مکانوں و لباس پر بھی بات کرتے نظر آتے ہیں ۔ اُنہوں نے جس طرح والدین کو اپنی خواہشات بالائے طاق رکھ کر اولاد کی خواہشات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ اُن کے افسانوں کا ہر کردار معاشی حالت ابتر ہونے کی وجہ سے پریشان دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانے

"پچھلے" میں ایسی ہی ماں کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنا چولہا جلانے کے لئے سردی کے دھند بھرے دنوں میں سڑکوں سے لکڑیاں اکٹھی کر رہی ہے۔ اس ماں کی کہانی یہ ہے:

"یہ بڑھیا یا اتنی سردی میں یہاں کیا کرنے آئی تھی جب اس کی سانسیں اعتدال میں آئیں تو وہ بسوں، کاروں، ٹرکوں اور ٹرالیوں کے پہیوں سے کچلے ہوئے گنے اکٹھے کرنے میں مصروف ہو گی ۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ چولہا گرم رکھنے کے لیے ایندھن کی تلاش میں یہاں آئی تھی۔ اس کا چولہا قریبی گاؤں کی کسی نکر میں تھا۔ اس چولہے سے کتنے لوگ وابستہ تھے۔۔۔۔ اس کے میل سے اٹے ہوئے ننگے پاؤں، پیوندوں سے سجا ہوا اس کا لباس، میلی کچیلی اس کے سر کی چادر، الجھے ہوئے روئی جیسے سفید۔"(۳۱)

باوا کے فسانوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانوں کی باطنی حالت سے زیادہ ظاہری حالت کو بیان کیا ہے۔ وہ اپنے کردار کو سفید پوش نہیں بننے دیتے بلکہ اس کی موجودہ حالت کو بیان کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کردار کی پسماندگی کا پڑھنے والے کو احساس ہو جاتا ہے۔ ان کے کردار خوددار اور جذبات و احساسات سے لبریز ہیں۔ وہ اپنی کہانی "ایک بوڑھی آس کا دکھانت" میں ایسے ہی ایک کردار کی معاشی پسماندگی کی حالت کی مصوری کرتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا مکمل خاکہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس خاکے میں اس شخص کی معاشی بدحالی کا منظر کچھ یوں:

"دالان بھی پورے گھر کی طرح کچا ہے۔ اور دھوڑ سے اٹا ہوا ہے۔ گھر کے اندر دو ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں بچھی ہوئی ہیں ۔ ایک پر بوڑھا برکت لحاف اوڑھے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس ہی میلا کچیلا حقہ پڑا ہوا ہے۔ جو پینے کے قابل نہیں رہا لیکن پھر بھی برکت علی کش پہ کش لگائے جا رہا ہے۔ پر کسی بھی کش میں کڑواہٹ نام کو نہیں ہے صرف دھواں ہے۔"(۳۲)

اس کہانی کی طرح ایک اور کہانی "قیدی" میں وہ اس سے بہتر معاشی بدحالی کا خاکہ بناتے ہیں۔ اپنے کردار کی کہانی شروع ہی معاشی ب پسماندگی سے کرتے ہیں۔ جس سے قاری کے ذہن میں تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ "قیدی" میں وہ اس طرح معاشی ب پسماندگی کا خاکہ بناتے ہیں۔

"وہ موسموں کی شدت سے بچنے کے لئے ہمیشہ سر پر ایک گندہ سا پٹکا رکھتا۔ اس کے جسم پر جو لباس ہوتا وہ گرمیوں اور سردیوں کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر اسے کبھی خوش قسمتی سے کپڑے دستیاب ہو جاتے تو وہ اس وقت تک چلتے رہتے جب تک وہ پھٹ نہیں جاتے۔ اگر موٹا لباس زیبِ تن ہوتا تو سارا موسم وہی چلتا۔ جس سائیکل پر طوطوں سے بھرا لوہے کی مہین سلاخوں والا پنجرہ ہوتا وہ بھی اس جیسا چِب کھڑبا اور ٹوٹا پھوٹا تھا۔"(۳۳)

ان سب مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جس طرح معاشی پسماندگی کا شکار لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ڈاکٹر شکیل احمد معاشی موضوعات پر یوں رقم طراز ہیں۔"معاشی موضوعات پر مشتمل اردو افسانہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ محروم، نادار اور حسرت زدہ انسانوں کی دھڑکنیں اردو افسانے کی رگ میں سرایت ہو کر رہ گئی ہیں۔"(۳۴) انہوں نے اپنے افسانوں میں محنت کش لوگوں کی بہترین الفاظ میں ترجمانی کی ہے۔ کیونکہ معاشی پسماندگی ازل سے ابد تک رہے گی۔ اس لیے انہوں نے اس موضوع پر لکھ کر اپنے افسانوں کو معاشی پسماندگی کا شکار لوگوں کا ترجمان بنایا ہے۔ کیونکہ معاشی پسماندگی سے ہر انسان کا واسطہ کبھی نہ کبھی تو پڑتا ہے۔

ب۔ طبقاتی کشمکش کی کہانیاں

طبقاتی کشمکش ایک ایسا نظام ہے۔ جس کے تحت انسانوں کو مختلف درجات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس نظام کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اعلیٰ طبقہ یعنی اشرافیہ اپنی ہر خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔ دولت کی وجہ سے وہ کسی کا بھی استحصال کر سکتے ہیں۔ جاگیرداروں کی وجہ سے معاشرہ طبقات میں منقسم ہوا۔ اردو افسانے کے آغاز میں بہت سے نام ایسے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر لکھا جن میں پریم چند، حیات

اللہ انصاری، دیوندر ستھیار تھی، کرشن چندر وغیرہ شامل ہیں۔ اس موضوع کو اردو افسانے کے لحاظ سے تقویت ترقی پسند تحریک نے پہنچائی۔ جاگیر داری سوچ اور طبقاتی تقسیم پر ایلن وڈز "بالشوازم " میں یوں لکھتے ہیں۔ ایلن وڈز" بالشوازم راہِ انقلاب "میں سرمایہ دار کی سوچ اور منافع کی ہوس پر لکھتے ہیں ۔ ”جاگیر بالائی سطح پر امیر کسانوں کا ایک طبقہ پروان چڑھا کر اور نچلی سطح پر بہت بڑی تعداد میں غریب کسان پیدا کر کے اندرونی تفریق کے عمل کو تیز کر کے سرمایہ داری کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں۔“(۳۵) حنیف باوا جس طرح طبقاتی کشمکش کی نشاندہی اپنی کہانیوں میں کرتے ہیں اس سے کوئی اور عمدہ مثال نہیں ملتی۔ ایک انٹرویو میں طبقات کی تقسیم اور کہانیوں میں بیان پر کہتے ہیں۔

"افراد کا طبقات میں منقسم ہو جانا بجائے خود تخلیق کار کے لیے ایک موضوع ہے۔ رہی بات آپ کے سوال کے نکتہ کی تو انسان فطری طور پر مظلوم کی طرف جھکاؤ کرتا ہے۔ تو طبقات میں بٹے معاشرے میں مظلوم کی دادرسی کرنا یا اس سے اظہار ہمدردی کرنا یہ ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔"(۳۶)

انہوں نے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا وہی لہجہ اور رویہ اپنی کہانیوں میں بیان کیا ہے جو انہوں نے اپنے آس پاس کے لوگوں کا استحصال ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان کے افسانے "شبنم سے دھلا دل" میں انہوں نے ایسے ہی نظام کی نشاندہی کرتے ہیں:

”ایک روز چودھریوں کو اپنی حویلی کو وسیع کرنے کا خیال آیا تو فوراً انھوں نے دتو موچی کو اپنے ڈیرے پر بلاوا بھیجا۔ دتو سہما سہما ان کے ڈیرے پر گیا اور بڑے چودھری کی پیڑھی کے دائیں پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔

"اوئے دتو ہم تمہارا کوٹھا لینا چاہتے ہیں۔ بول دیتا ہے کہ نہیں"

دتو اپنے کوٹھے کے بارے میں یہ سن کر کانپ گیا اور کہنے لگا چوہدری جی۔۔۔۔۔ ایسا نہ کریں میں اُجڑ جاؤں گا اور پھر میں اور میرے بچے کہاں جائیں گے۔

بڑے چودھری کے منہ سے ایک خوف ناک قہقہ بلند ہوا اور کہا " کچھ نہیں ہو گا تیرے بچوں کو"۔ یہ لے پکڑ چار سو روپے۔ ان سے کہیں اور جگہ لے کر بنا لینا نیا گھر۔۔۔۔۔شام تک یہ مکان خالی ہونا چاہیے بس۔" (۳۷)

اعلیٰ طبقے کا استحصال نچلے طبقے کی سوچ کو بھی متاثر کرتا ہے۔ کیونکہ جس وقت بھی نچلے طبقے کا انسان اعلیٰ طبقے کا گھر، بچے، بستی اور رہن سہن کو دیکھتا ہے تو خود بخود اس کے ذہن میں موازنہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حنیف باوا موازنے کی منظر کشی کہانی "گڑ کی چڑیاں چڑیا بیچنے والا" میں:

"آج وہ جس بستی میں سے گزر رہا ہے۔ یہ اس کی اپنی بستی سے یکسر مختلف ہے۔ اگر یہ مسکراہٹ ہے تو مولا کی بستی آنسو ہے۔ اگر یہ دن ہے تو وہ رات۔ اگر یہ خوشی ہے تو وہ دکھوں سے مملو ہے۔ اگر یہ شہر سے جڑی ہونے کے سبب زندگی کا پورا لطف اٹھاتی ہے تو وہ وہ جو یتیموں کی طرح شہر سے دور بے بسی کی زندگی گزار رہی ہے۔ شہر کی کوکھ سے پیدا ہونے والی سڑکیں صاف ستھری اور عمدہ ہیں۔ اتنی صاف ستھری اور عمدہ کہ مولے کا اپنا وجود گندگی کا ڈھیر لگنے لگتا ہے۔" (۳۸)

اشرافیہ یا اعلیٰ طبقہ اپنے بچوں کی نشوونما اس انداز سے کرتے ہیں کہ وہ عام انسانوں کو ایک عجیب الخلقت سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے خود کو اعلیٰ اور ان کو حقیر جانتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آنے والی نسلوں میں یہ فرق شدت اختیار کر جاتا ہے۔ جو معاشرے کے لئے کسی آفت سے کم نہیں ہے۔ معاشرے کا ترقی نہ کرنا اور فسادات کی وجہ سے طبقاتی پسماندگی ہے۔ جس کی وجہ سے انسانوں میں بھائی چارہ کم ہوتا جاتا ہے۔ معاشرے کا ہر فرد خود کو اعلیٰ اور دوسرے کو کم ظرف سمجھنے لگتا ہے۔ جس طرح "گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" میں جب بابا مولا نے کسی کوٹھی میں چند بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا تو آواز لگاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بچے ڈر جاتے ہیں۔ لیکن بابا مولا دل میں کچھ خواہشات لے کر کڑی دھوپ میں ان کا انتظار کرتا ہے۔ حنیف باوا یوں لکھتے ہیں:

"آج آخر اسے ایک کوٹھی کے باغیچے میں کھیلتے ہوئے بچے نظر آتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر وہ پھر گھنٹی بجاتا ہے اور آواز لگاتا ہے۔ میٹھی چڑیاں لے جاؤ۔ بابے مولے کی اجنبی اور عجیب سی آواز سن کر بچے بھاگ کر اندر چلے جاتے ہیں" (۳۹)

موجودہ دور میں طبقاتی تضاد بڑھ گیا ہے۔ اعلیٰ طبقہ پسماندہ طبقے کو احمق اور کم ظرف سمجھتا ہے۔ جس کی وجہ سے اعلیٰ طبقے کے بچے بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر اسی طبقاتی تقسیم کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اسی طرح طبقات کی تقسیم نے بچوں کی نفسیات کو متاثر کیا ہے۔ اس کی مثال "سوکھے پتے" میں وہ پیش کرتے ہیں ۔کم سن غریب بچی چولہا جلانے کے لئے گاؤں کے نمبردار کی کوٹھی کے قریب برگد کے سوکھے پتے اکٹھے کر رہی ہوتی ہے۔ اسی دوران تیز آندھی اور بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بچی ڈر کر آس پاس کوئی سہارا تلاش کرتی ہے تو اسے اپنے سامنے نمبردار کی کوٹھی نظر آتی ہے۔ جس کو حنیف باوا ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

"جب بارش کے ساتھ ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے تو برگد بھی اس کو اور اس کے پتوں کی حفاظت کرنے میں ناکام دکھائی دینے لگتا تھا۔۔۔۔۔ بچی نے جب گھبراہٹ میں کسی نئی پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو اسے سامنے والی کوٹھی میں بستی کے مالک کا ہیولیٰ نظر پڑی جسے دیکھ کر اسے جھرجھری سے آگئی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔ نہیں میں" کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں یہیں رہوں گی۔ اسی برگد کے نیچے۔" (۴۲)

طبقاتی پسماندگی جہاں معاشرے میں بگاڑ کی وجہ بنتی ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کی نفسیات کو بھی شدید متاثر کرتی ہے۔ یہ طبقاتی پسماندگی نسل در نسل شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ جس طرح" گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" اور "سوکھے پتے" میں دو قسم کے بچوں کی نفسیات کو کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی سوچ اس حد تک متاثر ہے کہ دونوں دوسرے طبقے کے لوگوں کو کوئی الگ مخلوق تصور کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔ طبقاتی نظام کی وجہ سے معاشرے میں ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور شدت اختیار کر چکا ہے۔ جس کی وجہ سے اشرفیہ اور پسماندہ طبقہ آسمان اور زمین کی مسافت تک دور ہو چکے ہے۔ اشرافیہ پسماندہ طبقے کو کم ظرف اور پسماندہ طبقہ اشرافیہ کو حیوان تصور کرتے ہیں۔ اس لئے دونوں طبقات منفی سوچ کو پروان چڑھا

رہے ہیں ۔ حنیف باوا موجودہ صورتحال کو مدِ نظر رکھ کر طبقاتی کشمکش کو اپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں ۔ "فصیلیں پر انڈیکس" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں اوپر والی سرکار یعنی نمبر دار نے گاؤں کے تمام لوگوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنا لیا ہے ۔اس افسانے میں بچے،نوجوان اور بوڑھے سب کے سب نفسیاتی طور پر خود کو غلام محسوس کرتے ہیں۔کیونکہ حاکمِ وقت ہی ا ن کا خدا ہے۔ وہ اس کے لیے جان تک دے سکتے ہیں۔"فصیلیں پر انڈیکس"میں حنیف باوا طبقاتی نظام کو کوستے ہیں:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس قدر اندھیرے میں صرف فصیل پر ہیں روشنی کے فوارے کیوں چھوڑے رکھے ہیں۔

"ہماری اوپر والی سرکار کا یہی حکم ہے"

"کیا آپ حکم کے غلام ہیں"

"ہاں۔" (۴۱)

حنیف باوا اپنے افسانوں میں طبقاتی پسماندگی کے ساتھ ساتھ معاشی پسماندگی کا نقشہ بھی کھینچتے ہیں۔انہوں نے وہی پسماندہ کردار اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں جو اشرافیہ سے بے حد نفرت کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں دولت سے زیادہ رہن سہن کی پسماندگی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی کہانی میں ایسا منظر پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پسماندہ کردار طبقاتی پسماندگی کے نظام سے بے حد متاثر ہو رہا ہے۔ باوا اپنی کہانی"نہر کی پٹڑی"میں ایسے کردار کی نفسیات کو بیان کرتے ہیں ۔ جو کام نہ ملنے کی صورت میں چوہدریوں کے کنویں سے پانی پیتا ہے تو وہ پانی اسے شہد سے بھی زیادہ میٹھا لگ رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اتنی دولت ہے وہ عیش پرستی سے زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ جب کہ وہاں کے لوگ بوند بوند پانی کو ترس رہے ہیں۔ حنیف باوا یوں لکھتے ہیں:

"اسے گر یہاں سے کچھ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ وہ تو مایوسی سے دور رہ کر سوچوں کی سیدھی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔۔۔۔ اسے چودھریوں کا کنواں چلتا سنائی دیا۔ اس نے سوچا کیوں نہ یہاں سے پانی پی لیا جائے۔ وہ وہاں پہنچا۔ دو گھونٹ پانی پیا۔ آج اسے اس کنویں

کا پانی شہد کی طرح میٹھا لگا۔ اس نے یہ بالکل نہ سوچا کہ یہ چودھریوں کے کنوئیں کی مٹھاس تھی یا اس کی بوجھل جیب کا کرشمہ تھا۔" (۴۲)

اُن کی کہانیوں میں اشرافیہ کی عکاسی علامتی طور پر کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی کہانیوں میں عمارتوں، ڈیروں اور فصلوں کا ذکر طبقاتی تقسیم کی علامت کے طور پر کرتے ہیں۔ جس سے قاری کو محسوس ہو جاتا ہے کہ انہوں نے طبقاتی تقسیم کی بات کی ہے۔ کیوں کہ اردو افسانے میں علامت کے ذریعے بہت گہری بات پُراثر انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ "سارنگی والا" میں حنیف باوا نے بلند اور پختہ عمارتوں کی علامت پیش کر کے ہمارے طبقاتی نظام پر ضرب کاری کی ہے۔ اور موجودہ دور کی عکاسی کی ہے کہ اشرافیہ کی نظر بلند اور پختہ عمارتوں سے باہر اپنے آس پاس کے پسماندہ لوگوں پر نہیں پڑتی۔ جس کی وجہ سے پسماندہ طبقہ ان عمارتوں کے درمیان اپنے کچے مکان دیکھ کر دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ "سارنگی والا" میں ایسے ہی کردار کی کہانی بیان کی گئی ہے جو پیشے کے حوالے سے میراثی ہے۔ وہ اپنا پیشہ اور مکان ہی سب کچھ سمجھتا ہے۔ اس کے بارے میں باوا لکھتے ہیں۔ "اللہ دتہ ایک ایسے محلے میں رہتا تھا جہاں اس کا کچا گھر بلند و بالا عمارتوں میں گھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ ان عمارتوں کا قیدی ہو۔ یہ گھر اسے باپ دادا کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔" (۴۳) حنیف باوا جہاں نسل در نسل جاہل اشرافیہ کی بات کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک ایسی نئی نسل کی بات کی جو تعلیم کے زیور سے بیدار ہو گئی ہے۔

وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد پسماندہ طبقے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کے آباؤ اجداد آج بھی وہی زندگی بسر کر رہے ہیں جو ان کی نسل در نسل وراثت تھی۔ افسانہ "کھنگی" میں باپ اپنے تعلیم یافتہ بیٹے کو کس طرح پسماندہ طبقے سے دور رہنے کی نصیحت کرتا ہے۔ "فرید پُتر، مانا کہ تعلیم نے تیرے اندر وسعت پیدا کر دی ہو گی۔ لیکن یہاں تم نے فرید بن کر نہیں رہنا۔ ایک جاگیردار کا بیٹا بن کر رہنا ہے۔" (۴۴) لیکن اس افسانے میں دوسری طرف جب فرید اپنے باپ کی بات کو بالائے طاق رکھ کر پسماندہ طبقے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو پسماندہ طبقے کے لوگ اس بات کو جاگیردار کی گستاخی سمجھتے ہیں۔ لیکن فرید تعلیم یافتہ نوجوان ہے وہ پسماندہ طبقے کی نفسیات کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں

نے نسل در نسل غلامی کی وہ تعلیمی شعور کے بغیر خود کو کیسے تبدیل کر سکتے ہیں۔ جب فرید کھیتوں میں اپنے ملازم سلھے کے پاس جاتا ہے تو وہاں کا منظر کچھ یوں ہے:

"دُھن بھاگ ہمارے آپ نے غریبوں کی جانب بھی چکر لگایا۔

آئیں منجی پر بیٹھیں" نہیں یار تو بیٹھ" فرید کا جواب تھا۔

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کھڑے رہیں اور آپ کا نوکر بیٹھ جائے۔ سلھا نہایت عاجزی سے بولا،

" لے یار اگر تو چاہتا ہے تو میں بیٹھ جاتا ہوں ،یہ کہہ کر فرید پائینتی کی طرف ہو کر بیٹھنے لگا۔۔۔

نہیں چودھری جی۔ یہاں نہیں اِدھر۔۔۔۔ سلھے نے سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔ یہاں بیٹھنے میں کیا میری شان میں کمی آ جائے گی۔۔۔۔ نہیں ایسی بات نہیں لیکن چوہدری کا کام پائینتی پر بیٹھنا نہیں۔ یہ کام تو ہمارے جیسے کمیوں کا ہے۔" (۴۵)

اس افسانے میں نئی نسل کا نوجوان دو متضاد سوچ کے حامل انسانوں سے وابستہ ہے۔ جو تعلیم سے انسانی طبقات کی تقسیم کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن اعلیٰ اور پسماندہ طبقے سے بے حد متاثر ہو رہا ہے۔ اشرافیہ کی تقسیم نے لوگوں کو بے حد متاثر کیا۔ کیونکہ ہمیشہ سے پسماندہ طبقہ اشرافیہ کے کام کاج گھروں اور کھیتوں میں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جب پسماندہ طبقہ اپنا ان کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو خود کو کوئی اور مخلوق تصور کرتا ہے۔ لیکن خدا کی طرف سے انسانوں میں کوئی فرق نہیں مثلاً ہوا، پانی اور پیدائشی عمل تمام انسانوں کا ایک جیسا ہے۔ لیکن معاشرے میں دولت کی تقسیم نے ان کو طبقات میں بانٹ دیا ہے۔ یہ معاشرے کے لیے ناگزیر ثابت ہوتے ہیں۔ جبکہ علی عباس جلالپوری "روایاتِ فلسفہ" میں طبقاتی نظام کو معاشرے لے لیے سود مند قرار دیتے ہیں۔ بقول علی عباس جلالپوری:

”ریاست میں تین طبقات کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ اعلیٰ طبقہ علم و عقل سے آراستہ خوش حال جس کے سپرد مملک کا نظم و نسق اور دفاع کیا جائے۔ طبقہ متوسط ہنر مندوں اور صنعت کاروں پر مشتمل ہو ۔ جو کاروبار اور لین دین کا کاروبار کریں۔ سب سے نچلے طبقہ غلاموں کا ہو جو بالائی طبقات کی خدمت پر مامور ہوں۔“(۴۶)

جب تک معاشرے میں طبقاتی نظام موجود ہے لوگوں کا استحصال ہوتا رہے گا۔ "ایک تھا حاکم" ایسا ہی افسانہ ہے جس میں حاکم لوگوں کا استحصال کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ دولت کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگوں کا ذہنی خدا بنا ہوا ہے۔ بستی کے لوگ اس کی پسند کا کھانا کھاتے ہیں۔ بستی کے سب بچے، نوجوان اور بوڑھے اس کے غلام ہیں۔ وہ حاکم کے حکم پر جان دینے کو تیار ہیں:

”اس بستی کے باسی کوہلو کے بیل کی طرح زندگی کے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ آنکھیں بند کیے۔ گردن میں حاکم کا جوا ڈالے۔۔۔ ۔ ان لوگوں کا کھانا، پینا، پہننا پرہیزی تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ پرہیزی کھانا حاکم کے دربار سے آتا ہے۔ کچھ کا ارشاد تھا نہیں۔۔۔ لیکن یہ ضرور کہا جاتا تھا کہ اس پرہیزی کھانے سے پیٹ ضرورت سے زیادہ ہلکا رہتا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ذرا بھی سکت باقی نہ رہے اور وہ اپنے مالک کو ہاتھ اٹھا کر سلام بھی نہ کر سکیں۔“(۴۷)

اشرافیہ کا کھانا، پینا، اوراوڑھنا پسماندہ طبقے کی دولت ہے۔ اگر پسماندہ طبقہ بغاوت کر دے تو اشرافیہ مفلوک الحالی والی زندگی بسر کریں ۔ کیونکہ اشرافیہ کے گھروں، کھیتوں اور فیکٹریوں میں پسماندہ طبقہ ہی کام کرتا ہے۔ ان سب کے باوجود پسماندہ طبقہ اشرافیہ کی نظر میں حقیر اور کمتر طبقے کے لوگ ہیں۔ دولت و عزت دینا تو دور کی بات وہ انہیں دیکھ کر بھی خوش نہیں۔ "کی جاناں میں کون" میں ایسے کردار کی کہانی ہے۔ جو پسماندگی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کردار کو دنیاوی دولت کا پتہ تک نہیں۔ اسے تو دو وقت کا کھانا مل جائے تو وہ ہر کسی کو خوشی خوشی دعا دیتا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ کردار اشرافیہ کی کالونی سے گزرے تو لوگ اسے کس حد تک نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسے باوا اس طرح پیش کرتے ہیں:

”ہمارے محلے میں زیادہ تر صاحبِ حیثیت لوگ رہتے تھے۔ انہیں صرف اپنے پیسوں سے غرض تھی کسی انسان سے محبت کرنا ان کے منشور میں شامل نہ تھا۔ تمام مفلوک الحال لوگوں ان کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔۔۔اس لئے جب کبھی وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے ابا ابا کہتا ہوا ان کے نزدیک جاتا تو وہ لوگ اس سے یوں نفرت کا اظہار کرتے۔

"نہ جانے ہر روز یہ پاگل کہاں سے آ جاتا ہے۔ جسے دیکھتے ہی ابکائی آنے لگتی ہے ہش پرے ہٹ، کپڑے میلے کرے گا کیا؟" (۴۸)

وہ اپنے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے ان کرداروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جنہیں بعض اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔" کی جاناں میں کون" میں دیوانے یعنی پاگل لڑکے کی کہانی ہے۔ جو دنیاوی دولت کی ہوس سے بے زار ہے لیکن پھر بھی اس کے محلے کے اشرافیہ اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسی کہانی کی طرح "سائیکس غلام" میں ایک غلام کی کہانی ہے جو بچپن سے بڑھاپے تک شہر کے امیر گھرانے میں دو وقت کی روٹی کے لیے کام کرتا رہا ہے۔ لیکن جب بڑھاپے میں اُسے سہارے کی ضرورت تھی اسے حویلی سے نکال دیا گیا۔ جب اس کو آزادی ملتی ہے تو وہ دیوانہ یعنی پاگل ہو چکا ہے۔ غلام کی کہانی کچھ اس طرح ہے:

”سائیکس شہر کے ایک رئیس لیوکس کا غلام تھا۔۔۔ اس کے اندر کی تمام توانائیاں دم توڑنے لگیں تو رئیس نے اسے آزاد کر دیا ۔ اب آزادی اس کے کس کام کی ۔۔۔۔ بیٹھے ہوئے اسے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے اس گلی کی بلند و بالا عمارتیں اس کو اپنے اندر جکڑ لیں گی۔

"نہیں! میں ان دیو ہیکل مکانوں کی دیواروں میں گھٹ کر مرنا نہیں چاہتا"۔۔۔

"میں اپنی ہڈیاں بچانے کے لئے چوری کروں گا"

"اب میں بھوک سے نہیں مروں گا"۔۔۔

"اب میں اسی گھر میں چوری کروں گا جہاں میرا خون پسینہ دفن ہے۔" (۴۹)

اشرافیہ کا ظلم و ستم نچلے طبقے پر کسی آسمانی آفت سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اشرافیہ زمینی خدا کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے غریب کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاں ہوتا ہے۔ پسماندہ طبقے میں بھی کرداروں کی تقسیم کاری ہوتی ہیں۔ پسماندہ طبقے کے کچھ لوگ آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں اور کچھ لوگ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر غلامی کی زندگی بسر کرنے والے کرداروں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو چاہتے ہوئے بھی اپنی پسماندگی کو ختم نہیں کر سکتے کیونکہ وہ زمینی خداؤں کے غلام ہیں۔ ان کی اچھی اور بری تقدیر کا فیصلہ اُن کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ صنعتی انقلاب کی بدولت معاشرہ آقا اور غلام والے طبقات میں بٹ گیا۔ صعنتی انقلاب نے جہاں پیداواری شعبے میں اشیاء کی پیداوار میں اضافہ کیا ساتھ ہی انسانوں کو غلام بنا دیا۔ علی عباس "روایت فلسفہ" میں صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے طبقات کی تقسیم پر لکھتے ہیں۔ "دخانی انجن اور کپڑے بننے کی کلو ں کی ایجادات سے نئے نئے علائق پیدا وار کا ظہور ہوا اور معاشرہ بوزہ اور پرولتاری طبقات میں بٹ گیا۔"(۵۰) غریبوں کے جذبات و احساسات کو اشرافیہ کی مرضی روند کر گزر جاتی ہے۔ لیکن وہ صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ "مانگے سے عشق نہیں ملتا" ایسا ہی افسانہ ہے جس میں اونچ نیچ کی دیوار دو دلوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ طبقاتی نظام کی وجہ سے سچی محبت کرنے والا جوڑا چوہدری اور کمی کی اولاد ہے۔ اس فرق نے ان دونوں کی جان لے لی۔ طبقاتی تقسیم کے بارے میں حنیف باوا اپنی کہانی "مانگے سے عشق نہیں ملتا" میں لکھتے ہیں:

> "وہ گاؤں کے نمبردار کا بیٹا شکور تھا۔۔۔۔" اور کہاں میں فقیرے میراثی کی کملی دھی۔ کہاں وہ نمبرداروں کا لاڈلا بیٹا" "کیا وہ بھی تم سے پیار کرتا تھا"
>
> "ہاں کرتا تھا۔ بہت کرتا تھا"
>
> پر ہمارے درمیان جو اُونچ نیچ کی دیوار کھڑی کر رکھی تھی اس نے ہمارے بیچ سدا کا بچھوڑا ڈال دیا۔"(۵۱)

دو دلوں کا ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانا طبقاتی نظام پر سخت ضرب کاری کرتا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ سے اشرافیہ پسماندہ طبقے پر ظلم و ستم کرتا آیا ہے۔ ان کی خواہشات کا استحصال نظر آتا ہے۔ حنیف باوا بے شمار مثالوں سے طبقاتی

نظام کی نشاندہی کرتے ہیں۔لیکن یہ طبقاتی نظام ہمارے معاشرے میں تن آور درخت کی طرح مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ان کے افسانوں میں موجودہ دور کے طبقاتی نظام کی عکاسی کی گئی ہے۔انھوں نے چودھریوں کے ظالمانہ راویے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریروں میں مجبوراور لاچار لوگوں پر تشدد دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے افسانے "ایک بوڑھی آس کا دکھانت"میں برکت کے اکلوتے بیٹے پر چوہدری کا تشدداور والدین کی آس وامید کا منظر بیان کیا گیا ہے۔اکرم والدین کا اکلوتا نوجوان بیٹا ہے۔جس کو چودھری زمین کے ٹکڑے کے عوض بیچ دیتا ہے۔بوڑھے ماں باپ آج تک اس کی یادوں کے سہارے زندگی بسر کررہے ہیں ۔بوڑھی ماں آج تک اسی سڑک پر نظریں اورامیدیں جمائے بیٹے کے واپس آنے کا انتظار کررہی ہے۔جس سڑک پر چل کر وہ آخری دفعہ چودھری کے بلاوے پر حویلی گیا تھا:

"اکرم کی ماں چھوڑ اس موئی کھڑکی کو آجا۔۔۔وہ اب نہیں آئے گا۔۔۔"نہیں اکرم کے ابا ۔ میرا پُتر واپس آجائے گا" ،"تیرے پُتر کو تو چودھری زمین کے ایک وسیع و عریض ٹکڑے کی عوض گاؤں کے دیگر نوجوانوں کے ہمراہ انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔" (۵۲)

اُنھوں نے اپنی تحریروں میں جہاں غلامی کی زندگی بسر کرنے والے پسماندہ طبقے کی بات کرتے ہیں وہاں آزاد پسماندہ طبقے کی کہانیاں بھی پیش کی ہیں۔یہ آزاد پسماندہ طبقہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔جو گاؤں اور شہروں کی گلیوں میں پسماندگی کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"قیدی"اور"دائرے میں گھرے لوگ"آزاد پسماندہ طبقے کی کہانیاں ہیں۔ان کے کردار خوانچہ فروش ہوتے ہیں۔وہ گلیوں میں بھوکے پیٹ اور گندے لباس سے چیزیں بیچ رہے ہوتے ہیں۔اشرافیہ ان سے کچھ خریدنا اوران کے بارے میں جاننا بھی پسند نہیں کرتی۔"قیدی"میں ایسے ہی خوانچہ فروش کی کہانی ہے۔جو طوطے بیچ رہا ہے۔ "دوچار روز کے بعد وہ ہمارے محلے کا چکر ضرور لگاتا ہے۔وہ کہاں سے آتا تھا؟کون سی گلی کا باسی تھا؟کیا اس کا گھر بڑی بڑی اور بلندوبالا عمارتوں میں گھرا ہوا کراہ رہا تھا۔"(۵۳)

اس طرح کی پوشیدہ لفظی علامتوں سے انھوں نے طبقاتی نظام کے بگاڑ کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ۔"دائرے میں گھِرے لوگ"اور"قیدی"میں ایسے لوگوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔جن کی خوشیاں اور غمیاں مال کے بکنے کے گرد گھومتی ہیں ۔ایسے کردار معاشرے میں رہ کر بھی اپنے ہونے کا احساس کسی کو

نہیں دِلا سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اشرافیہ اور درمیانے طبقے کے لوگ توجہ نہیں دیتے۔"دائرے میں گھِرے لوگ "ایسے کمسن بچے کی کہانی ہے۔ جو والد کی وفات کے بعد اس کے پیشے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ اپنے گھر کا چولہا جلانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن معاشرے کی طبقاتی تقسیم اس کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ ”وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر ہانک لگاتا ہوگا اور اس کی یہ ہانک گلی کی بلند و بالا عمارتوں کی بند کھڑکیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہوگی۔ وہ مایوس ہو کر بھاری قدموں سے اس گلی کو خیر آباد کہتا ہوگا۔“(۵۴)

وہاپنی تحریروں میں زیادہ تر اعلیٰ طبقے اور پسماندہ طبقے کی نشاندہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں درمیانے طبقے کے مسائل کی طرف کم توجہ دی ہے۔ کیوں کہ پسماندہ طبقہ ہی ان کی کہانیوں کا مرکز رہا ہے۔ انہوں نے طبقاتی پسماندگی کے تحت پیدا ہونے والے مسائل اور رِدعمل کو بیان کیا ہے۔ طبقات کی تقسیم کاری کسی بھی معاشرے کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ جس کو حنیف باوا نے اپنی کہانیوں میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی ضرب المثل کے تحت پیش کیا ہے۔ انہوں اپنے قلم سے معاشی بدحالی اور طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ ثقافتی پسماندگی پر بھی ضرب لگاتے ہیں۔ حنیف باوا نے جس طرح ثقافتی پسماندگی کو پیش کیا اس کو اگلے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

ج۔ ثقافتی پسماندگی کی کہانیاں

ا۔ ثقافت

دنیا میں ہر معاشرہ اپنی ایک ثقافت رکھتا ہے۔ کیونکہ ثقافت ہی معاشرے کے افراد کو ایک راہ دکھاتی ہے۔ جس راہ پر چل کر وہ اپنے رسم و رواج ،اقتدار، معمولات اور عقائد کو اختیار کرتے ہیں۔ ثقافت وہ واحد ذریعہ ہے جس کی وجہ سے معاشرے دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ثقافت ہی معاشرے کو الگ پہچان اور منفرد حیثیت پر فراہم کرتی ہے۔ دیکھا جائے تو ثقافت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کچھ نئے اقدار، رسم و رواج اور علوم شامل ہوتے ہیں۔ جن کے بدلے میں پرانے رسم و رواج ختم ہو جاتے ہیں۔

۲۔ ثقافت کا مفہوم

ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کا طرز زندگی ہے۔ وہ تمام اموراس میں شامل ہیں جن سے معاشرے کے افراد تفریحی و شوق ، جمالیاتی ذوق اور فنی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ثقافت کو انگریزی زبان میں کلچر کہتے ہیں ۔ جس کے معنی ہیں کسی چیزیاذات کی جسمانی اورذہنی نشوونما اوراصلاح وغیرہ ۔ اسے عربی کے لفظ "ثقف" سے بھی لوگ ماخوذ کرتے ہیں۔ جس کے معنی دانائی، عقلمندی اور مہارت کے ہیں۔ دیکھا جائے تو ثقافت قدرتی ماحول اور قدرت کی طرف سے بنائی ہوئی چیزوں کے برعکس ہے۔ جو انسان نے خود تخلیق کی ہیں۔ لہٰذا ثقافت ایسا عمل ہے جس کے تحت انسان زندگی بسر کرنے کے طریقے نکالتا ہے۔

۳۔ ثقافت کی مختلف اقسام

ماہرین عمرانیات وبشریات نے ثقافت کو چاراقسام میں تقسیم کیاہے۔ جو درج ذیل ہیں۔

۱۔مثالی ثقافت	۲۔ حقیقی ثقافت
۳۔مادی ثقافت	۴۔ غیر مادی ثقافت

مثالی ثقافت

اس سے مراد ایسی ثقافت جو لوگوں کے عمل اور کردار کے لیے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض چیزوں کو لوگ مثالی حیثیت دیتے ہیں ۔ اس کا شدت سے اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً معاشرے میں جھوٹ بولنے کو بُرا تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ گھر ، دفتر تقریباہر جگہ پھر بھی جھوٹ بولا جاتا ہے۔

حقیقی ثقافت

اس سے مراد ایسی ثقافت ہے۔ جو عملی طورپر لوگوں میں پائی جائے۔ اس قسم میں معاشرہ ہم سے توقع کررہا ہوتا ہے کہ اس پر ہم عمل کریں ۔ مگر لوگ اپنے مفاد کے لیے رشوت لے رہے ہیں ۔ کسی کا حق کھا

رہے ہیں ۔ ہم حقیقی طور پر ان کاموں پر عمل کر رہے ہوتے ہیں ۔مثلاً ہمارے معاشرے میں تمام پڑھے لکھے افراد عورت کو برابری کا درجہ دیتے ہیں۔ مگر حقیقی طور پر ایسا نہیں ہے۔

مادی ثقافت

مادی ثقافت سے مراد ایسی چیزیں جو مخصوص وجود رکھتی ہوں۔ ان کو چھوا جاسکے اور ان کو ماپا جاسکے۔ ان چیزوں کو انسان ہی نے تخلیق کیا ہے۔ ہمارے مکان، موٹر کاریں، لباس، ٹیلی فون، میز اور کرسیاں وغیرہ کو مادی ثقافت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

غیر مادی ثقافت

غیر مادی ثقافت سے مراد ایسی اشیاء یا چیزیں جن کو چھوا نہیں جا سکتا بلکہ ان کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ درج ذیل عناصر کو غیر مادی ثقافت میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلا عقائد، زبان، معاشرتی آداب، معاشرتی افراد، رسم و رواج اور معاشرتی ادارے وغیرہ۔ غیر مادی ثقافت انسانی رویے پر اثرانداز ہوتی ہے۔

ثقافت کی خصوصیات بھی لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن میرا موضوع حنیف باوا کے اردو افسانوں میں ثقافتی پسماندگی کی کہانیاں بیان کرنا ہے۔ اس لیے اب اُن کے اردو افسانوں میں ثقافتی پسماندگی کی نشاندہی کرتا ہوں۔ حنیف باوا نے طبقاتی کشمکش، معاشی بدحالی کے ساتھ ثقافتی پسماندگی پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانوں میں ثقافتی پسماندگی کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مادی اور غیر مادی ثقافت کو بیان کیا ہے" خود سے مکالمہ" میں اُنہوں نے ثقافتی پسماندگی کو بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے آباؤ اجداد کی ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”میں اس لحاف میں سمٹا بیٹھا ہوں ۔ جو مجھے میرے لکڑ دادا پڑدادا اور والد کی جانب سے ورثہ میں ملا ہے۔۔۔۔۔۔
>
> 'میں دنیا کی طرح کیسے آنکھیں بند کرلوں میں تو دنیا سے مختلف ہوں"

"تو اور دنیا سے مختلف۔ کچھ عقل کے ناخن لو بھائی۔ ایک طرف تو تُو اپنے آباؤاجداد کی جانب سے ودیعت کئے ہوئے لحاف کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے اس میں سکڑے سمٹے بیٹھے ہو اور دوسری جانب خود کو دنیا سے علیحدہ تصور کر رہے ہو"

"اپنے جد امجد کے لحاف کو اوڑھ کر دنیا سے وابستگی پیدا ہو جاتی ہے کیا۔"(۵۵)

وہ ثقافتی پسماندگی کو بیان کر کے معاشرے میں ختم ہوتی ثقافت پر ضرب کاری کا کام کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں احساس دلانے کی کوشش کی کہ آباؤاجداد کے اطوار کو بھول کر نہیں جیا جا سکتا۔ ثقافت ہی ہمارا بنیادی ہتھیار ہے۔ جو ہم نے وراثت میں اپنے آباؤ اجداد سے وصول کیا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہم اپنی رسوم اور عقائد کی حفاظت کریں۔ معاشرے میں ثقافت ہی گروہوں کو ممتاز کرتی ہے۔ نئی نسل مغربی ثقافت کو اپنانے میں مصروف ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے اسلاف کی ثقافت کو بھول رہے ہیں۔ حنیف باوا اسی ثقافت کی پسماندگی اور بقا پر بات کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ "دائرے میں گھرے لوگ" ایسا ہی افسانہ ہے۔ جس میں باپ دادا کی طرف سے ودیعت کی ہوئی ریڑھی اور پیشہ نسل در نسل زمانے کے ساتھ چل رہا ہے۔ لوگ اپنے آباء کا پیشہ چھوڑنا نہیں چاہتے لیکن معاشرے کی بے رخی کی وجہ سے یہ سب اُن کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ حنیف باوا پسماندگی کے حوالے پر بات کرتے ہیں:

"اس کی قلفیوں والی ریڑھی بڑی پرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کے باپ دادا کے وقت کی ہو، یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کا دادا مرتے وقت یہ ریڑھی اپنے بیٹے کو دے گیا ہو اور اس کے بیٹے نے جیتے جی ہی یہ ریڑھی اپنے بیٹے کے حوالے کر دی ہو۔"(۵۶)

معاشرے کی حالات و واقعات ادیب کی سوچ کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔ کیونکہ جس دور کی معاشرت کو دیکھنا ہو اس وقت کے ادیبوں کا مطالعہ کریں۔ ان کی تحریروں میں اس وقت کا معاشرہ اور ثقافت سامنے آجاتی ہے۔ جہاں معاشرے میں جدید ٹیکنالوجی نے ترقی کی ہے۔ وہاں معاشرے کے لوگ اپنی ثقافت سے بے حد دور چلے گئے۔ "دُودزدہ آدمی" افسانے میں بابا کرم الٰہی اپنے گاؤں کی چکی کی ٹھک ٹھک سے بہت پیار کرتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اس کے بارے میں سوچ کر بے حد پریشانی کے عالم میں زندگی بسر کر رہا

ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ وہ اس ثقافتی ورثے کو ناپید ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ بابا کرم الٰہی گھگو کی ٹھک ٹھک سے اپنے اندر نیا جوش اور جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اس ثقافتی ورثے کو آنے والی نسل میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ "چکی کی یہ ٹھک ٹھک کتنی پیاری ہے۔ خدا کرے یہ ٹھک ٹھک ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ اس گھگو کی یہ آواز بوڑھے کرم الٰہی کو نہ جانے کیوں اچھی لگتی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ "[۵۷]

ختم ہوتی ثقافت کو اُنہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی تا کہ آنے والی نسلیں اپنے آباء کی ایجادات سے مستفید ہو سکیں۔ نئے ترقی یافتہ دور میں اپنے آباء کی ثقافت کو چھوڑنا اور نئی ثقافت کو اپنانا معاشرتی ضرورت ہے۔ لیکن ترقی پذیر معاشروں میں لوگ اپنے آباء کی ایجادات سے مستفید ہوتے ہیں۔ حنیف باوا کے افسانوں میں مٹتی ثقافت کے آثار دِکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ختم ہوتی ثقافت اور اُس سے وابستہ لوگوں کی نشاندہی کی ہے۔ "گڑیا کی چڑیاں بیچنے والا" ایسا ہی افسانہ ہے جس میں ثقافتی پسماندگی کی لہر موجود ہے۔ اس میں حنیف باوا اس دُور کی بات کرتے ہیں جب لوگ چاند پر پہنچ گئے اور اُس کی گڑ والی چڑیاں ابھی اسی قیمت پر بکتی ہیں جو اسے ورثے میں ملی۔ پیسے کی کم ہوتی قدر اور بچوں کی بڑھتی خواہشات حنیف باوا کے بقول:

"وہ اپنی ایک لمبی سوٹی سے گڑ اتار کر چڑیوں کو جنم دینے لگتا ہے جب کوئی بچہ یہ کہتا ہے۔

"بابا مولا دس پیسے کی اتنی چھوٹی چڑیا"

بابا مولا بڑے پیار سے کہتا ہے۔

"پُتر لا بڑی بنا دیتا ہوں"

بابا مولا دس پیسوں کی اس چڑیا کو مزید بڑی بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ بابے کی چڑیوں کا مول تول مدتوں سے دس پیسے ہے جبکہ مولا خود بوڑھا ہو چکا ہے۔ "[۵۸]

معاشرے میں مٹتی ثقافت اور ثقافتی اشیاء سے دوری کو حنیف باوا نے اپنے افسانوں میں بیان کیا۔ نئی نسل کی چیزوں سے ناآشنائی ہی ثقافتی پسماندگی کا پھیلاؤ بنتی ہے۔ معاشروں کو ثقافت ہی الگ پہچان اور رسوم پر فراہم

کرتی ہے۔"گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" میں بچوں کی نا آشنائی ہی ثقافتی پسماندگی کی وجہ بنتی ہے۔اس کے بارے میں باوایوں رقمطراز ہیں:

”رب کی قسم میں کوئی منگتا نہیں۔نہ میں کوئی بچے اٹھانے والا ہوں۔۔۔۔ہاتھ جوڑتا ہوں، گڑگڑاتا ہوں۔۔۔۔گڑ کی میٹھی چڑیاں لے جاؤ۔لیکن وہ کسی بھی چڑیا کو جنم نہ دے سکا۔اُس کی آواز اور گھنٹی کی ٹن ٹن دونوں مر جاتی ہیں۔ “ (۵۹)

معاشرے میں ثقافت کی منتقلی آباء کی بدولت ہی ممکن ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ہمارے آباؤ اجداد خود کو جدید اور معاشرے کا فرد تصور کرتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے آنے والی نسل کو ثقافتی پسماندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نئیر ثقافتی بحران پر کہتے ہین۔" افسانہ نگار نے اس افسانے میں مشرقی ثقافتی نظام کی گہرائیوں کو بیان کیا ہے۔"(۶۰) "پھول چہروں سے پھوٹتی روشنی" میں ایسی بڑھیا کی کہانی ہے جو اپنے اجداد کی ریت و رواج کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ثقافت کا نسل در نسل زندہ رہنا ہی معاشرے کی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ ”اس کھلونے کو اس نے اپنے بیٹے کو اس لیے نہیں دیا کیونکہ وہ اس کھلونے کو اپنے ہاتھ سے اپنے پوتے کو دینا چاہتی ہے ۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ایسے کھلونے بوڑھے ہاتھ ہی ننھے ہاتھوں میں تھماتے اچھے لگتے ہیں۔ “ (۶۱)

"پھول چہروں سے پھوٹتی روشنی" اور گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" دونوں افسانوں میں ثقافتی فقدان کی نشاندہی کی گئی جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ حنیف باوا اپنی تحریروں کے ذریعے ختم ہوتی ثقافت کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اپنی تحریروں سے لوگوں کو احساس دلانے کی کوشش بھی کرتے ہیں ۔ انہوں نے اپنی بہت سی تحریروں میں ثقافتی ورثے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔"ماں" ایسا افسانہ ہے جس میں مٹتی ثقافت کو بڑے دردناک لہجے میں بیان کیا ہے۔ حنیف باوا ہمارے نئی نسل کے اس رویے سے سخت پریشان ہیں۔اپنے آباء کی رسوم اور ایجادات کو چھوڑ کر نئی طرز پر زندگی بسر کرنے والے ان کے نزدیک احمق ہیں ۔ "ماں"میں ایسے کنوئیں کی کہانی ہے جو ہمارے آباء کی زندگی کی علامت ہے۔پرانے زمانے میں کنوئیں ، دریا ،جوہڑ اور ندی نالے ہی زندگی کی علامت تھے۔لوگ پانی والی جگہوں

پر زندگی بسر کرتے تھے۔ مشرقی ثقافت میں کنوئیں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن جدید دور نے ہمیں اپنے آباء کی ثقافت سے دور کر دیا ہے۔ دیکھا جائے تو ہم نے خود ہی اس ثقافتی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے:

"اس کنوئیں کے پاس چار پانچ کچے مکان تھے۔ جو اب بے آباد ہیں۔ جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس کنوئیں کو اجڑے ہوئے کوئی زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ یہ کنواں جب آباد ہو گا نہ جانے کتنے مسافروں ، کتنے آنے جانے والوں ، بوڑھوں، جوانوں، مٹیاروں اور بچوں نے اپنی پیاس بجھائی ہو گی۔۔۔ لیکن آج یہ کنواں ان لوگوں کے ہاتھوں کے لمس کو ترس رہا تھا۔" (٦٢)

ثقافت ہی معاشرے کو الگ اور ممتاز پہچان کی راہ دکھاتی ہے۔ حنیف باوا یہی ثقافتی راہ ہم کو دکھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس پر عمل کر کے ہم دنیا میں اپنے آباء و اجداد کی نظروں میں مہذب قوم بن سکتے ہیں۔ حنیف باوا نے اپنی کہانیوں میں مٹتی ہوئی ثقافت کو بڑے فن کارانہ طریقے سے واضح کیا ہے۔ کوئی بھی قوم اپنے آباء کے اقدار، عقائد اور رسوم کو چھوڑ کر معاشرے میں مہذب نہیں بن سکتی۔ اُنہوں نے اپنی کہانیوں میں ختم ہوتی ثقافت، اگلی نسل میں ثقافت کا منتقل نہ ہونا اور پرانی ثقافت پر عمل کر کے معاشرے میں بدحالی کا شکار لوگوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں لوگ نسل در نسل ایک ہی ہنر پر زندگی بسر کرنے والے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا گناہ یہ ہے کہ وہ اپنے اجداد کے ہنر اور ہمارے معاشرے کی ثقافت کو اپنائے ہوئے ہیں ۔ جو ازل سے ان کی گھٹی میں موجود ہے۔ ایسی کہانیاں بھی موجود ہیں جن کا کردار اپنے آباء کے ہنر پر جان تک دینے کو تیار ہیں۔ اپنے آباء کے ہنر پر ہی گھر کا چولہا جلانے کی کوشش ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ "سارنگی والا' حنیف باوا کی ثقافتی پسماندگی کی سوچ کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتا ہے۔ افسانے کا کردار اپنے آباء کے فن کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ سخت معاشی بدحالی کا شکار فنکار فن کو چھوڑنا اپنے آباء کی توہین سمجھتا ہے۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان یہ مکالمہ ہوتا ہے:

"میری بات مان۔۔۔۔۔ چھوڑ اس دھندے کو۔۔۔۔ کوئی ڈھنگ کا کام کر لے"۔

"میں نے تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے مجھے سارنگی چھوڑنے کا مت کہا کر، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے اگر چھوڑ دیا تو مرجاؤں گا"۔۔۔ وہ تو باپ دادا کے ودیعت کئے ہوئے فن کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔اب تو اسے یہ فن اپنے خاندان سے رخصت ہوتا دکھائی دینے لگا تھا۔۔۔ "سارنگی کے کھو جانے کا غم "۔۔۔بیوی نے حیرانی سے اللہ دتہ کی بات کو دہرایا۔ "

"ہاں۔۔۔۔جب میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا تو سارنگی کو کون سنبھالے گا۔ " (۶۳)

کیونکہ ثقافت انسان کی تخلیق کردہ چیزوں پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے ثقافت میں کچھ چیزیں مردوں اور کچھ عورتوں کے کرنے کی ہوتی ہیں۔ثقافت کی ترقی کے لیے مرد اور عورت دو جسم ایک جان کا کام کرتے ہیں۔" سارنگی والا" میں جب فنکار کو اپنا فن اگلی نسل یعنی اپنے بیٹے کو منتقل کرنے کا کوئی حل نظر نہ آیا تو ایک دن اس نے یہ فن اپنی بیٹی کو منتقل کرنے کا سوچا۔ جس کے یہ الفاظ ہیں۔ "بیٹی۔۔۔۔ آج سے میں تمہیں سارنگی کے فن سے آگاہ کروں گا۔ ایسا کرنے سے میں اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جاؤں گا۔ " (۶۴)

ثقافت ہمارے آباؤ اجداد کے طور طریقوں اور رہن سہن کا نام ہے۔ اس کی بقا اور ترقی ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔ اُنہوں نے کہانیوں میں ثقافتی پسماندگی کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ہماری ثقافت جو موجودہ دور میں ناپید ہو رہی ہے اس کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ جس طرح معاشرے کی ترقی مرد عورت مل کر کرتے ہیں۔اس طرح ہمارے ثقافت کی پسماندگی کو ختم کرنے کے لیے ہمارے معاشرے کے مرد وعورت کو بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔"چھتر چھاؤں " میں ایسی ہی گھریلو ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔جو ہمارے معاشرے کی عورتوں کا زیور ہے۔گھروں کی خوبصورتی ہی عورتوں سے ہے۔ لیکن جب عورت ہی جدید دور کی خواہ ہو تو پرانی ثقافت دم توڑ دیتی ہے۔ثقافت کی پسماندگی کے بارے میں بوڑھی ماں کے "چھتر چھاؤں" میں یہ الفاظ ہیں:

"وہ کہتی ہیں دیکھو بچو ! جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے ہاتھوں کو استعمال میں لانا چاہیے۔ جب تم ہانڈی پکانے لگو تو اس میں مرچیں کونڈی سوٹے رگڑ کر ڈالو۔ کپڑے مشین سے دھونے کی بجائے ہاتھ سے دھویا کر۔ میں تو کہتی ہوں تم آٹا بھی ہاتھ والی چکی سے پیس کر کھاؤ۔ لیکن میری بچیوں کو ان کی یہ باتیں بری لگتی ہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ آج کے جدید دور میں یہ سب کچھ کیوں کریں۔ " (۶۵)

ثقافت ہی معاشرے کو پہچان دیتی ہے۔ معاشرے میں رہ کر انسان ثقافت کی بدولت اپنی راہ تلاش کرتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے آباء کے پیشے سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور کچھ نئے دور کی جدید چیزوں کے پیچھے اپنے آباء کی ایجادات سے دستبردار ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنی کہانیوں میں مٹتی ثقافت اور نسل در نسل ثقافت کی منتقلی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجودہ دور میں ثقافت کو اپناتے ہوئے جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کی نشاندہی اور وجوہات کو بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں شاذونادر ایسے ہنر ہیں جن کو موجودہ دور میں ترقی مل رہی ہے حنیف باوا نے افسانوں میں ثقافتی پسماندگی کو پیش کر کے ہمیں ہماری ثقافت سے آشنائی کروائی ہے۔ ثقافت اور معاشرے کی ترقی لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرہ یا الگ قوم کا تصور ہی ثقافت پر مبنی ہے۔ ہر قوم رسم ورواج، اقدار، عقائد اور تمام معاملات زندگی میں دوسری قوم سے الگ ہے۔ اس لیے حنیف باوا موجودہ دور کی ثقافتی اہمیت پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فیروزالدین،(مرتب)فیروزاللغات،فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۱۸مئی ۲۰۱۴ء،ص۶۸۷

۲۔ فیروزالدین،(مرتب)فیروزاللغات،ص۶۸۷

۳۔ سلیم احمد،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸ء،ص۴۳۳

۴۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۲ء،ص۴۱

۵۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،ص۵۵

۶۔ عامر عبداللہ،تنہائیوں کے درمیاں،(مضمون)مطبوعہ:چہارسو،شمارہ۲۳،جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی،ص۲۸

۷۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۸ء،ص۱۰

۸۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،ص۱۴

۹۔ ایضاً،ص۲۱

۱۰۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۲ء،ص۶۰

۱۱۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،ص۶۱

۱۲۔ گلزار جاوید،براہِ راست،(مضمون)مطبوعہ:چہارسو،شمارہ۲۳،جولائی،اگست،۲۰۱۴ء،راولپنڈی،ص۸

۱۳۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،ص۶۷

۱۴۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،ص۸۰

۱۵۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۸ء،ص۲۴

۱۶۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،ص۲۶

۱۷۔ ایضاً،ص۲۹

۱۸۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۲ء،ص۹۰

۱۹۔ علی عباس جلالپوری،جنسیاتی مطالعے،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۱۷۶

۲۰۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،ص۱۳۲

۲۱۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،مثال پبلشر۲،فیصل آباد،۲۰۱۸ء،ص۳۵

۲۲۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،ص۶۸

۲۳۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیاں،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۲ء،ص۱۶۳

۲۴۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۵

۲۵۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۱۸۱

۲۶۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۲۳۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۴۲

۲۸۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹۲

۲۹۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۱۰۱

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۳۱۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۷

۳۲۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۲۷۴

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۸۱

۳۴۔ شکیل احمد، ڈاکٹر، اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، نصرت پبلیشر، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص ۴۰۲

۳۵۔ ایلن ووڈز، بالشوازم۔۔ راہِ انقلاب، مترجمہ، ایس این شوریدہ، طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز، لاہور، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۵۰

۳۶۔ گلزار جاوید، براہِ راست، (مضمون) مطبوعہ: چہار سو، شمارہ ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص ۸

۳۷۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۷

۳۸۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۲۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۲

۴۱۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷

۴۲۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۹۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۹۱

۴۴۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۷

۴۵۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۴۹

۴۶۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵۲

۴۷۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۵

۴۸۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۱۷۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۵۰۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۴

۵۱۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۵۷

۵۲۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷۸

۵۳۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۲۸۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۰

۵۷۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۵۸۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۱۹

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۲

۶۰۔ ناصر عباس نیرّ، ڈاکٹر، افسانوی ادب میں قابلِ ذکر اضافہ، (مضمون) مطبوعہ: چہار سو، شمارہ ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص ۲۲

۶۱۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۶۵

۶۲۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹۶۳۔۴۔

۶۳۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۹۲

۶۴۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، ص ۹۴

۶۵۔ ایضاً، ص ۹۸

باب سوم:

حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کردار عصری تناظر میں: تجزیاتی مطالعہ

الف۔ کردار

کہانی کے واقعات جن افراد کے ذریعے پیش جاتے ہیں انہیں اصطلاح میں کردار کہتے ہیں۔ ایسی ہر صنفِ ادب جس میں کہانی کا دخل ہو لازمی کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ادیب کرداروں کی بدولت قاری کے سامنے کہانی کا منظر پیش کرتا ہے۔ کرداروں کے ذریعے ہی مصنف کہانی میں تجسس پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ کسی افسانے، ناول، داستان، ڈرامے کسی بھی منظوم کہانی پر بحث کرتے ہوئے اور اس کہانی کے ادبی مقام کا تعین کرنے کی وجہ سے ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ادیب یا مصنف نے کردار نگاری کی کیسی صلاحیتوں کو اپنایا ہے اور کہانی میں زندہ کردار کتنے تخلیق کیے ہیں۔ کسی بھی اصنافِ نثر کی کہانی کا سارا دارو مدار مرکزی کردار کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کہانی کو آگے چلانے کے لئے ضمنی کرداروں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ کرداروں کے اقسام کے حوالے سے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ”کردار اصلاً دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ ایک ٹائپ یا جامد د دوسرے ڈرامائی یا متحرک، جو کردار ٹائپ ہوتے ہیں وہ کسی طبقے، گروہ یا کسی معاشرتی جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت ماہ و سال کے سانچوں میں ڈھل کر پختہ ہو جاتی ہے۔ اور ان کا کردار اس اعتبار سے جامد ہوتا ہے کہ زندگی کے بدلتے ہوئے متغیرات ان کا ساتھ نہیں دیتے۔۔۔۔ ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص حالات میں ان کا کیا ردعمل ہو گا ۔دوسری اقسام کے کردار جنہیں ڈرامائی کہا جاتا ہے بہ امتدادزمان و واقعات کے فشار سے متاثر ہو کر بدلتے رہتے ہیں۔ “ (1)

کسی بھی کہانی کا مرکز کرداروں کے گرد ہی گھومتا ہے کہانی میں دلچسپی اور معاشرت کی عکاسی ادیب کرداروں سے کرواتا ہے۔ کسی مصنف کا وہ کردار کامیاب سمجھا جائے گا جو ساری دنیا کے انسانوں جیسا ایک عام انسان ہونے کے باوجود بھی ایسی انفرادیت کا بھی مالک ہو کہ اسے ہجوم میں الگ پہچان سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی واضع انفرادیت کے باوجود ہمیں ہماری دنیا کا قرین قیاس معلوم ہو۔ اسی طرح کامیاب کردار کی یہ بھی خاصیت ہے کہ وہ مصنف کی انگلیوں پر ناچنے والی کٹھ پتلی نہ ہو بلکہ اس کی اپنی ایک شخصیت ہو۔ کامیاب کردار کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ وقت ،ماحول اورواقعات سے متاثر ہو کر تبدیل ہونے یا نہ ہونے کی سکت اپنے اندر رکھتا ہے۔

کرداروں کی اقسام

کسی بھی کہانی کو بنانے کے لیے ادیب کو کچھ کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ کرداروں کی وجہ سے کہانی میں میں دلچسپی اور تجسس پیدا ہو تا ہے۔ کہانی میں استعمال ہونے والے کرداروں کی درج ذیل اقسام ہیں۔

مرکزی کردار

ایسا کردار جو کسی بھی کہانی میں شروع سے لے کر آخر تک موجود ہو اور ساری کہانی اس کردار کے گرد گھومتی ہوئی نظر آئے۔ اپنی حرکت و عمل سے وہ فعال کردار ادا کرتا ہوا نظر آئے تو فنی نقطہ نظر سے اسے مرکزی کردار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ سماجی و معاشرتی صورتِ حال اسے مرکزی حیثیت دلاتی ہے۔ یہی کردار کہانی کو انجام تک لے جاتا ہے۔ مرکزی کردار عام طور پر ہمہ جہت شخصیت کا مالک ہو تا ہے۔ ایسے کردار کو کہانی میں مختلف زاویوں سے پرکھا اور دیکھا جاتا ہے۔ یہ کردار شروع سے لے کر آخر تک ہمیں کہانی میں نظر آتا ہے۔ کہانی کے کسی بھی حصے سے یہ جدا نہیں ہو سکتا ہے۔

ثانوی کردار

دیکھا جائے تو کہانی میں صرف ایک ہی کردار کو مرکزیت حاصل نہیں رہتی کیونکہ ایک کردار کہانی کو مکمل نہیں کر سکتا۔ اس طرح کہانی کی تفصیلات اور جزئیات مکمل طور پر ہمارے سامنے آ سکیں۔ اس لیے کہانی میں تصویر کا مکمل اور دوسرا رخ دیکھنے کے لیے لیے مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کردار یا کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اکثر ثانوی کردار ہی مرکزی کردار کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ کہانی میں مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کردار کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ عام طور پر مرکزی کردار کی تمام خصوصیات ثانوی کردار میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کہانی میں ثانوی کردار کی معاونت کی بدولت ہی مرکزی کردار کہانی کو انجام تک پہنچاتا ہے۔

ذیلی کردار

مرکزی اور ثانوی کرداروں کے ساتھ ذیلی کردار کسی بھی کہانی کا لازمی حصہ بنتے ہیں ۔ ذیلی کردار ثانوی اور مرکزی کرداروں کے درمیان نظر آتے ہیں۔ ایسے کردار کسی بھی کہانی میں مرکزی اور ثانوی کرداروں کی معاونت کا کام سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کرداروں کا عمل کہانی میں ضمنی سے ہوتا ہے۔ ان کرداروں کو کہانی میں موقع محل کی مناسبت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کردار مختصر وقت کے لئے آتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے کہانی کے منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے کردار کہانی میں ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ موقع کی مناسبت سے آتے ہیں ۔ اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں اور منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔

اکہرے کردار

کسی کہانی کا وہ کردار جو صرف ایک ہی طرز عمل یا رویے کا مالک ہو اسے اکہرے کردار کہتے ہیں ۔ ایسے کردار کہانی میں ایک ہی طرز یا رویے سے حرکت و عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سے صرف اور صرف ایک جیسے طرز عمل اور رد عمل کی امید یا توقع کی جاتی ہے۔ ایسے کردار کہانی میں کسی خاص

سوچ، طرز فکر اور طبقے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کرداروں کی مدد سے ادیب معاشرے کے کسی خاص پہلو کی نمائندگی کروارہا ہوتا ہے۔

سپاٹ کردار

کسی بھی کہانی میں شروع سے لے آخر تک ایک جیسا رویہ رکھنے والے کردار کو سپاٹ کردار کہتے ہیں۔ اس قسم کے کرداروں میں انہونی حالات نہیں پائے جاتے۔ ایسے کردار کہانی میں طے شدہ رد عمل کو پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے کرداروں سے کسی خاص صورتِ حال میں کسی خاص ردِ عمل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دیکھا جائے تو ان میں خاص ردِ عمل یعنی حالات کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت موجود ہی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر کسی جانونی، مذہبی گروہ اور ناکامیوں سے دوچار کردار اس کے اہم مثالیں ہیں۔ جو ہر حالات میں ایک ہی رد عمل پیش کرتے ہوئے ہمیں نظر آرہے ہوتے ہیں۔

مرکب کردار

کہانی میں ایک سے زائد طرز عمل اور رویوں کی حامل کردار کو مرکب کردار کہا جاتا ہے۔ دو متضاد صلاحیتوں کے مالک ہونے کی وجہ سے یہ کردار کہانی میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ لیکن کسی کہانی میں ایسے کردار لازماً شامل کیے جاتے ہیں جو کسی واقعہ میں ایسا طرز عمل پیش کرتے ہیں اور ایسا ردِ عمل کرتے ہیں جس سے کہانی میں ان کی شخصیت دو متضاد پہلوؤں کو ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ ایسے کرداروں کو کہانی میں دوہرا کردار ادا کرنے کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کرداروں کے ذریعہ کسی خاص واقعے کے ذریعے مطلوبہ اہداف اور نتائج کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

عارضی یا محدود کردار

عارضی یا محدود کردار ایسے ہوتے ہیں جو عارضی اور وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہ کردار کہانی میں موقع محل کے مطابق عارضی طور پر کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ خاص وقت پر ظاہر ہوتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کرنے کے بعد غائب ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کسی ایک عارضی یا محدود کردار سے مختلف قسم کے افعال و اعمال کی

ادائیگی ممکن نہیں اس لیے کہانی میں مخصوص مناظر میں کئی عارضی یا محدود کردار سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ ان پر گہری چھاپ نہیں لگ سکتی اس لیے وہ عارضی اور وقتی طور پر وہ روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

مجہول کردار

کسی بھی کہانی کے ایسے کردار جو اپنے افعال و اعمال میں جھول رکھتے ہوں ایسے کردار کمزور طرزِ عمل کے بنا پر مجہول کردار کہلاتے ہیں۔ یا کہانی میں ایسے کردار جو اپنا مقصد یا تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ہی ختم ہو جائیں ان کو مجہول کردار کہا جاتا ہے۔ مجہول کردار کہانی میں بُرا تاثر پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نقلی کردار

جب ادیب کسی گروہ (لسانی، مذہبی، سیاسی یا علاقائی) یا فرقہ پرست کردار تخلیق کرتا ہے ہے تو اس کا انداز متعصبانہ نہیں ہونا چاہیے۔اس کو غیر جانبدار ہونے چاہیے۔اس تخلیق کار کے تعصبانہ رویے کی وجہ سے کردار زندگی کی حقیقت سے دور ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر ایسے کردار کو نقلی کردار کہا جاتا ہے۔

مزاحیہ کردار

کسی بھی کہانی میں ہنسانے والے کردار کو مزاحیہ کردار کہتے ہیں۔ تحریر میں یہ کردار اپنی حرکات و سکنات سے مزاح کا تاثر پیش کرتے ہیں۔ یہ کردار عام طور پر قاری کو دل بہلانے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح کے کردار کسی بھی فن پارے میں ہنسی مذاق کی بدولت فن پارے میں مزاح کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

پیچیدہ کردار

باطنی کیفیت کے حامل ،نہ سمجھ میں آنے والے اور پیچیدہ شخصیت کے حامل کردار پیچیدہ کردار کہلاتے ہیں۔ کہانی میں جہاں ادھورا ے، نامکمل اور اکہرار کردار پائے جاتے ہیں تو اس سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لیے پیچیدہ کردار ضروری سمجھے جاتے ہیں ۔ ایسے کرداروں کی فکر، سوچ ، حرکات و سکنات اور طرز عمل کسی نہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کی مرہون منت ہوتی ہیں۔

اصلاحی واخلاقی کردار

کہانی میں ایسا کردار مقصدیت کے تابع ہوتے ہیں اور تخلیق کاران کی بدولت اچھائی اور برائی کے اصلاحی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔

منفی کردار

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو بلحاظ صنف جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا ہے۔اگر بلحاظ صنف و جنس درجہ بندی کی جائے تو کہانی میں مردانہ اورزنانہ یعنی نسوانی کردار نظر آتے ہیں۔ مردانہ کردار کی خوبیاں ،خامیاں اور جدوجہد کا عمل نسوانی کردار میں بھی ملتا ہے۔

رومانوی کردار

ایسے کردار کہانی میں واقعاتی اتار چڑھاؤ اور مجموعی فضا کے مطابق ہی ہوتے ہیں ۔ایسے کردار ہمیشہ جذباتیت کا شکار ہوتے ہیں۔یہ کردار حسن و عشق کو ہی بنیادی زندگی کا مقصد اور حاصل سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

باغی کردار

ایسے کردار جو معاشرے کے بالادست طبقے سے بغاوت کریں انہیں باغی کردار کہتے ہیں ۔ معاشرے میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام ، پات بات ،مذہب کی تقسیم کاری، طبقاتی امتیازات، اور خاندانی نظام کی وجہ سے بغاوت کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔کسی بھی معاشرے میں بغاوت کا یہ عنصر ہمیں وہاں کی تحریروں میں مل جاتا ہے۔ جس کو تخلیق کار اپنی کہانی میں بآسانی جگہ دیتا ہے۔ ایسے کردار جو معاشرے کی مروجہ رسم ورواج سے سے بغاوت کریں انہیں باغی کہا جاتا ہے۔

ب۔ پسماندہ طبقات

معاشرے میں معاشی حوالے سے مختلف طبقات وجود میں آتے ہیں ۔ان طبقات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں اعلیٰ طبقہ / اشرافیہ ،متوسط طبقہ / درمیانہ طبقہ اورادنیٰ طبقہ / نچلا طبقہ کسی بھی

معاشرے میں یہ تین طبقات موجود ہوتے ہیں۔ ان طبقات کی موجودگی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کا ادیب اپنی تحریروں میں ان طبقات کو پیش کرتا ہے اوران کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اردو افسانے میں طبقاتی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کو سب سے پہلے منشی پریم چندنے بیان کیا۔ اس روایت کو تقویت "ترقی پسند تحریک" نے دی۔ ترقی پسند تحریک کے مصنفین نے "ادب برائے زندگی" کا نعرہ لگایا۔ ان کی تحریروں میں پسماندہ طبقے کی نشاندہی کی اور معاشرے میں جاگیر درانہ یا طبقاتی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا گیا۔ نچلے طبقے کی مصیبتوں اور محرومیوں میں اشرافیہ کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس میں اضافہ وہ خود کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر انوار احمد نچلے طبقے کے لیے پیدا کردہ محرومیوں پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ بقول انوار احمد:"

> " نچلے طبقے کی کچھ محرومیوں تو بالائی طبقے کی عطا کردہ ہیں۔ مگر ان کی مصیبتوں میں اضافہ ان کی جھوٹی انا، ناک اونچی رکھنے کی خواہش، بدلہ لینے اور حسد کے آتشیں کھیل میں اپنا اور دوسروں کا گھر پھونکنے کی آرزو سے ہوتا ہے "۔ (۲)

وہ بھی ترقی پسند تحریک کے منشور کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں معاشی بدحالی، ثقافتی پسماندگی اور طبقاتی کشمکش کو بیان کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی تحریروں میں پسماندہ طبقے کی ترجمانی کی جس کی وجہ سے انہوں نے انسان دوستی اور حب الوطنی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اُن کے افسانوں کا مرکزی کردار ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی تحریروں میں زیادہ تر مرکزی اور ثانوی کردار ادنیٰ طبقے سے ہیں ۔ ضمنی کرداروں کو اعلیٰ اور متوسط طبقات سے اخذ کیا گیا ہے۔ انتظار باقی مضمون "حقیقت پسند کہانی نگار" میں باوا کی کردار نگاری پر بیان کرتے ہیں۔ "اُن کے افسانوں کے کردار کسی باہر کی دنیا سے درآمد شدہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے اپنے ماحول کے ہیں۔۔۔ کبھی کبھی کسی کردار سے قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ یہ تو وہ خود ہے اور بیتے جانے والے واقعات تو اس کی زندگی کا حصہ ہیں۔"(۳)انہوں نے اپنی تحریروں میں ادنیٰ طبقے کے ایسے کرداروں کا ذکر کیا ہے جو پیشے کے لحاظ سے معاشی بدحالی اور پسماندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حنیف باوا کی تحریروں میں درج ذیل پیشوں کا ذکر ملتا ہے۔

خوانچہ فروش گداگر لکڑہارا بھانڈ موچی دکاندار

مزدور دیوانے ملازمت پیشہ طبقہ محنت کش عورتیں مفلوک الحال

ادیب بیرون ملک جانے والے افراد کوچوان

ا۔ خوانچہ فروش

خوانچہ فروش فارسی زبان کالفظ ہے۔ جس کامطلب پرات یا سینی میں سامان رکھ کر بیچنے والا ہے۔ خوانچہ فروش کا تعلق عام طور پر ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ جو اپنی معاشی حالت کو بہتر کرنے اور گھر کا چولہا جلانے کے لیے شہر اور دیہات کی گلیوں میں چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں ان کرداروں کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ ان کے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ "گڑ کی چڑیاں بیچنے والا" میں اُن کے نزدیک ایک خوانچہ فروش کی ظاہری اور مالی حالت یہ ہے:

> "چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں، منہ زرد، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، بدن پر مشت بھر چیتھڑے، یہ حلیہ بابے مولے کا ہے۔۔۔۔ اس کے ایک ہاتھ میں گھنٹی ہے۔ وہ ہر کوٹھی کے آگے رک کر پہلے گھنٹی بجاتا ہے پھر آواز لگاتا ہے۔
>
> 'آجاؤ پُترو"
>
> آجاؤ دھیو، آجاؤ بچیو"
>
> "میٹھی چڑیاں لے جاؤ۔ " (۴)

انہوں نے اپنے افسانوں میں ایسے موضوعات پیش کیے ہیں۔ جو معاشرتی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے ایسے طبقات کی نمائندگی اور تصویر کشی کی جو ہمارے معاشرے میں ناپید ہو رہے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کی ظاہری حالت بیان کرتے ہیں بلکہ ان کے اس انداز یا طریقہ کار کو بھی بیان کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ چیزیں بیچتے ہیں۔ دور حاضر میں ایسے کرداروں اور پیشوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرنا حب الوطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ایسے کردار ہیں جن کو معاشرے میں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے ان کی اہمیت

اور خواہشات کو پیش کر کے دور حاضر کی جدید جدید ٹیکنالوجی پر ضرب لگادی۔'ادھورے ہاتھ " میں حنیف باوا ایسے کردار کی کہانی بیان کرتے ہیں جو دونوں ہاتھوں سے اپاہج ہے۔ لیکن وہ معاشرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔وہ اپاہج تھیلے میں کچھ سامان ڈال کر شہر کے چوک میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا سامان بیچ کر ہی اپناگھر چلاناچاہتاہے حنیف باوااس اپاہج کاانداز بیان کرتے ہیں:

"جب بھی کوئی اس کے پاس سے گزرتاتوتووہ بڑی خوداعتمادی سے آواز لگاتا

"ایک نمبر مال ہے بچوں کے لیے،بڑوں کے لیے بھی، میرا مال ذائقے دار نہ ہو تو پیسے واپس لے جائیں"

"دس روپے کاایک پیکٹ۔اس میں بچوں کی پسند کی ہر چیز ہے۔ " (۵)

ہمارے معاشرے میں جہاں لوگ اپنی معذوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ اس معذوری سے رزق حلال کمانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اُنہوں نے جن خوانچہ فروشوں کی نمائندگی کی وہ خودداراور غیرت والے ہیں۔ موجودہ دور میں اس قسم کی کہانی اور کردار معاشرے کی ترقی میں اہم کردارادا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسی کہانیاں جرات اور بہادری سے مسائل کا سامنا کرنے کا درس دیتی ہیں۔پروفیسر صفدر علی مضمون "باہر کا آدمی "میں حنیف باواکے کرداروں کی معاشی پسماندگی پر یوں رقم طراز ہیں۔

" حنیف باوا اپنے کردار کا معاشی پسِ منظر سب سے پہلے تلاش کرتے ہیں ۔۔۔ اس کا ہر کردار ماحول سے بے زار، نہ معلوم سی آواز کا شکار، ذہنی کشمکش میں مبتلا ، چاروں طرف کی دنیا سے پریشان، احساس تنہائی سے دوچاراور ناساز گار ماحول کا پروردہ مجبور و محبوس ہے۔ "(۶)

"دو خالی ہاتھ " میں ایسے خوانچہ فروشوں کاذکر ہے جو مسلمانوں کے تہوار پر بھی اپنی معاشی حالت سے دوچار ہو کر چیزیں فروخت کررہے ہیں ۔ معاشرے ایسے افراد کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن یہ افراداپنی چیزیں بیچنے کے لئے جو آوازیں لگاتے ہیں وہ ان کے وجود کا احساس معاشرے کو دِلاتی ہیں۔حنیف باوالکھتے ہیں:

> ”عید گاہ کے باہر صرف ایک پیڑ تھا۔ جس کی مختصر سی چھاؤں میں ایک دوریڑھی والے اور کچھ خوانچہ فروش بیٹھے تھے۔ان کی ظاہری شکل و صورت سے ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے اگر وہ عید کے روز بھی چھٹی کر لیتے تو شاید ان کے چولہے نہ جلتے۔ وہ اپنے اپنے سودے کو فروخت کرنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ “ (۷)

اُن کی زیادہ تر کہانیوں کا مرکزی کردار ادنیٰ طبقے سے ہے۔انہوں نے جدید دور میں جب لوگ چاند پر جا چکے ہیں اپنی کہانیوں میں پسماندہ طبقے کی ترجمانی کی ہے۔ان کی کہانیوں میں زیادہ تر مرکزی کردار معاشی جنگ لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔انہوں نے حسن و عشق جیسے موضوعات پر لکھنے کی بجائے معاشی بدحالی کا شکار ادنیٰ طبقہ ہی اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے اور ادنیٰ طبقے کے زیادہ تر پیشے انہوں نے بیان کیے ہیں ۔ برصغیر کی زرخیز مٹی سے سونا اگلوانا اسی کے باسیوں کو آتا تھا۔انگریز حکمرانوں نے یہاں جبر و استحصال کی بنیا درکھی۔اس سے معاشرے میں بہت سے نئے افراد اور پیشے پیدا ہوئے۔ڈاکٹرا نور سدید اپنی کتاب "اردو افسانے کی کروٹیں میں " برصغیر کے دیہاتی کرداروں پر بات کرتے ہیں۔بقول انور سدید: ” برصغیر کا دیہات اگرچہ اُونگھ رہا ہے لیکن یہ زندگی کے داخلی تصادم سے ہرگز ہی نہیں ہے۔پلاٹ ، کردار اور فضا کے ان گنت انوکھے روپ آغوش میں پرورش پا رہے ہیں۔اس کے کرداروں میں تحرک اور زندگی موجود ہے۔“(۸)

" وہ ایک شخص " ایسے ہی ایک کردار کی کہانی ہے۔جو پیشے کے لحاظ سے خوانچہ فروش ہے۔اس کی دکان داری اور سادگی کے بارے میں حنیف باوا لکھتے ہیں:

> ”شہر کے صدر بازار کے انصاری چوک میں ایک شخص جس کا نام برکت اللہ تھا۔چاول چنوں کی ریڑھی لگاتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔مال اس کے پاس اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بس اتنا جتنا اس کے چھوٹے چھوٹے پتیلوں میں سما جائے۔ ان کے تمام برتن ہمیشہ صاف ستھرے ہوتے۔ “ (۹)

اُنہوں نے انہ صرف پسماندہ طبقات کے پیشوں کا ذکر کیا بلکہ ان کی حالتِ زار کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ان کے جذبات و احساسات کو بھی بیان کیا ہے۔ایسے پیشوں سے وابستہ لوگ صرف اور صرف اپنا چولہا جلانے کی

حد تک کام کرتے ہیں ۔ یہ لوگ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔ "ہارا ہوا آدمی" اس فسانے میں ایک اڈھیر عمر خوانچہ فروش کا ذکر ملتا ہے جو قریہ قریہ جاکر اپنی چیزوں کو بیچتا ہے۔ لیکن معاشرے میں کوئی اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ حنیف باوا کے بقول خوانچہ فروش:

> "وہ صبح سویرے خوانچہ گردن میں لٹکائے آبیٹھتا۔۔۔۔ اس کی دکان سات کانوں پر مشتمل تھی۔ جن میں سے پانچ خانوں میں ٹافیاں، بھنے ہوئے چنے، ڈال سویاں، نمکین اور میٹھی پھلیاں ہوتی تھیں۔ چھٹے خانے میں جھاڑو ہوتا اور ساتواں خانہ خالی ہوتا۔ جو اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب کوئی ننھا منھا گاہک آئے اور اس کے منہ میں چند سک ڈالے۔ " (۱۰)

وہ اپنی تحریروں میں پیشوں کی پسماندگی کے ساتھ ساتھ اشیاء کی پسماندگی بھی بیان کرتے ہیں۔ جس طرح گڑ کی چڑیاں، میٹھی پھلیاں اور دال سویاں وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نئی نسل ناواقف ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ناپید ہوتے پیشہ اور چیزوں کا ذکر کر کے ہماری ثقافت کو سہارا دیا ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ثقافت ہی معاشرے کی الگ پہچان ہے۔ انہوں نے خوانچہ فروشوں کے جذبات و خواہشات کے ساتھ ساتھ ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کی عاجزی اور شکر گزاری بھی بیان کی ہے۔

۲۔ گداگر

گداگری مراد وہ پیشہ ہے جس میں کچھ لوگ اپنے آپ کو معزور اور نادار ظاہر کر کے گزراوقات کے لئے دوسروں سے مانگتے ہیں۔ گداگر دیہاتوں اور شہروں میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ جدھر بھی جائیں یہ لوگ نظر آتے ہیں ۔ یہ پیشہ اور اس سے وابستہ لوگ روزبروزبڑھ رہے ہیں ۔ ان لوگوں کی بڑھتی تعداد معاشرتی اور قومی ترقی میں رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ گداگروں کو درجہ ذیل تقسیم میں جاسکتا ہے،

معذور گداگر

ایسے افراد جو پیدائشی کی حادثاتی وجہ سے جسمانی لحاظ سے معذور ہوں۔ یہ لوگ معاشرے میں ذریعہ معاش نہ ہونے یا کوئی سہارانہ ہونے کی وجہ سے مجبوراًاس پیشے کو اختیار کرتے ہیں۔

بے روزگار گداگر

ایسے لوگ جو محنت مزدوری سے روزی کمانا چاہتے ہیں لیکن کام نہ ملنے کی صورت میں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مجبوراً بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔

جدی گداگر

ایسے افراد جن کے آباؤ اجداد اسی پیشے سے وابستہ تھے۔ یہ لوگ بڑے فخر سے ان کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔

بے سہارا گداگر

ایسے افراد، بچے، عورتیں جو لاوارث ہوتے ہیں۔ مختلف حادثات کی وجہ سے لاوارث ہونے والوں کا معاشرے میں کا کوئی مقام نہیں ہوتا اوران کے پاس کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی پوری کرنے کے لیے یہ لوگ اس پیشے کو اختیار کرتے ہیں۔

بالواسطہ گداگر

جو افراد بذاتِ خود تو گداگری نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے کرواتے ہیں۔ ایسے لوگ بچوں کو اغواء کر کے یا مجبوراور لاچار والدین سے بچوں کو کرائے پر لے کر یہ پیشہ اختیاار کرواتے ہیں۔

اردو افسانے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ابتداء سے ایسے ایسے موضوعات موجود ہیں جن کو دور حاضر کے افسانہ نگار عصری تناظر میں بیان کر رہے ہیں۔ گداگری ایسے موضوع جس پر پہلے پہل حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، پریم چند وغیرہ لکھا ہے اس کے بعد یہ روایت افسانے کا جزو بن گئی۔ ڈاکٹر شکیل احمد "اردو افسانے میں سماجی مسائل "میں گداگری کے پیشے پر یوں لکھتے ہیں کہ: ”گداگری معاشرے کی بدترین لعنت ہے۔ ضمیر کو مردہ کرنے کا احساس خودی کو مٹانے میں گداگری کو بڑا دخل ہے۔ اکثر افسانہ نگاروں نے بھیک مانگنے والوں کو موضوع بنایا ہے۔“ (۱۱) اُن کے افسانوں میں ان تمام اقسام کے گداگر پائے جاتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہمیں پیغام دینے کی کوشش کی کہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ہمارے

معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں زیادہ تر لوگوں نے گداگری سے پیسے کمانا شروع کر دیئے۔ اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے اس لیے زیادہ تر اللہ تعالیٰ، رسول ﷺ اور صدقات کے نام پر بھیک مانگتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے معاشرے میں ان افراد کی تعداد میں روز بروز روزاضافہ ہوتا جارہا ہے

" سسکتی زندگی" میں حنیف باوا ایسے ہی ایک بے سہارا گداگر کی کہانی بیان کرتے ہیں ۔ جو اپنے علاج معالجے کے لیے لوگوں کو اپنی ادویات کی پرچی دکھاتا ہے اوران سے چند پیسوں کی امید کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں حقدار کو حق نہ ملنے کی وجہ بہروپیے ہیں۔ جو کسی چیز کا حق نہ رکھتے ہوئے بھی حقدار بن جاتے ہیں۔ حنیف باوا بے سہارا گداگر کی کہانی یوں پیش کرتے ہیں:

> ”کھانسی نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ اس میں اب مزید چلنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ وہیں پر بیٹھ جائے لیکن جب اسے کمبل میں لپٹا ہوا ایک شخص نظر آیا تو اس نے اپنے اپنی تمام قوت کو یکجا کر کے جیب سے ایک کاغذ نکالا۔۔۔ باؤ نے اس کاغذ کو پکڑا، پڑھا اس کے ہونٹوں پر ایک مہین سے امید بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن جیسے ہی وہ باؤ کاغذ کے اس ٹکڑے کو اس کے ہاتھ میں تھما کر آگے بڑھا تو اُسے ایسے لگا جیسے وہ باؤ اس کی امیدوں بھری مسکراہٹ کو چھین کر لے گیا ہو۔
>
> "تم لوگوں کا تو کام ہی یہی ہے۔ کس کس کی سنیں۔ “ (۱۲)

کسی بھی معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور معاشی بدحالی سے زیادہ بگاڑ کی وجہ حق دار کو حق نہ ملنا بنتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں ایسے بے سہارا افراد کی تصویر کشی کی جو حقدار ہوتے ہوئے بھی اپنے حق سے محروم ہیں۔ "ادھورے ہاتھ" میں بے روزگار گداگر کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جو حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھیک میں ملے پیسوں سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ جس روز اس کا سامان نہ بکتا وہ لوگوں کے دیے ہوئے پیسوں سے گزر بسر کرتا ۔ ایسے لوگ بہت خودار ہوتے ہیں۔ لیکن حالات ان کی خوداری کو بدل دیتے ہیں ۔ "ادھورے ہاتھ" میں بے روزگار گداگر کے بارے میں باوا لکھتے ہیں:

> "بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جب صبح سے لے کر شام تک اُس کی حق حلال کی کمائی میں ایک پیسہ بھی نہیں ملتا تو آن واحد میں مایوسی کے گہرے سائے اُسے اپنی گرفت میں لے لیتے جس سے اس کا دل بجھتا سا جاتا اور وہ اُسی بجھے ہوئے دل کے کہنے پر پاؤں کی جانب جھکتا اوراُن بھیک میں دیے ہوئے پیسوں کو اپنےاُن ادھورے ہاتھوں سے اٹھاتا اورجیب میں ڈال لیتا جن ہاتھوں سے اپنی پیاری بہنوں کی جانب سے سے تیار شدہ پیکٹ بیچتا تھا۔ " (۱۳)

وہ اپنے افسانوں میں گداگروں کی ظاہری اور باطنی حالتِ زار بیان کو بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ معاشرے میں ایسے افراد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ معاشرہ اور معاشرے کے افراد اُن لوگوں پر توجہ نہیں دیتے۔ یہ لوگ لاچاراور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔"دو خالی ہاتھ" میں ایسے کردار کی کہانی ہے جو معاشرے میں رہتا ہوا لاچاری اور بے بسی کی زندگی گزاررہا ہے۔کوئی بھی اس کے رہن سہن ، کھانے پینے اور پہننے کے بارے میں جاننا نہیں چاہتا ۔ کیونکہ اس کا تعلق گداگری سے ہے۔ ایسے کردار معاشرے میں بے نامی زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے ایسے کرداروں کی ترجمانی اپنی کہانیوں میں کرتے ہیں۔ "دو خالی ہاتھ" میں بھکاری بچے کا کردار:

> " ان بھکاریوں کے جھرمٹ سے ذرا ہٹ کر منحنی اورلاغر سا ایک بچہ اپنے ننھے منے ہاتھ پھیلائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ لیکن اس کی چپ میں گداگری کا وہ شور تھا کہ الاماں۔ اس نے جیسے صدیوں سے ٹھکرائے اور نفرتوں کی دھول میں اَٹے ہوئے غلیظ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اُس کے ننگے پاؤں پر جمی میل کی ایک دبیز تہہ دیکھی جا سکتی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ مدتوں سے نہایا نہ ہو یا اسے نہلایا نہ گیا ہو۔ " (۱۴)

انہوں نے نہ صرف اس پسماندہ پیشے کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی بلکہ اس سے جڑے لوگوں کی ظاہری تصویر کشی بھی کی۔ ان لوگوں کی تصویر کشی کر کے حنیف باوا موجودہ دور میں انسان دوستی اور حب الوطنی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی ترقی سے لوگ چاند پر سفر کرتے ہیں تو ادیب ان کی کہانیاں بیان

کرتے ہیں۔ لیکن حنیف باوا ایسے لوگوں کو زمینی حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاشرے کی ترقی بہت سارے افراد کو روندتے ہوئے گزر رہی ہے لیکن روندے ہوئے افراد اس ٹیکنالوجی پر افسردہ ہیں۔ معاشرے حقیقی طور پر اس وقت تک ترقی کرتے ہیں جب طبقات اور معاشی بدحالی سے کسی فرد کا واسطہ نہ پڑے۔ "ایک حبس زدہ رات" میں حنیف باوا جدی یعنی آباؤ اجداد سے گداگر کردار کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانی ایک ایسی عورت کی ہے جو پیشہ ور بھکارن ہے۔ اس کی گود میں آنے والی نسل کا بھکاری پرورش کر رہا ہے۔ شہر کے مشہور چوک میں بچہ اپنی گود میں اٹھائے صبح سے شام تک بھیک مانگتی ہے۔ باوا یوں رقمطراز ہیں:

> "اس بھکارن کا ایک بچہ تھا۔ جو ہمیشہ اس کی دائیں جانب بیٹھتا۔ اس کی عمر تقریباً آٹھ دس ماہ کی تھی۔ وہ ہمیشہ روتا بسوتا رہتا۔ لیکن بھکارن جو اس کی ماں تھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتی۔ وہ تمام دن اسی طرح بلکتا رہتا۔ جب شام ہوتی، بھکارن اپنے سامنے پڑے سکوں کو سمیٹتی اور روتے بسورتے بچے کو گود میں اٹھاتی اور اپنے گھر کی طرف چل پڑتی۔ اس کا یہ روز کا معمول تھا۔" (۱۵)

انہوں نے اپنی کہانیوں میں تقریباً تمام اقسام کے بھکاریوں کی کہانیاں بیان کی ہیں۔ انہوں نے بالواسطہ گداگروں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ جو خود تو بھیک نہیں مانگتے بلکہ عورتوں لاوارث بچوں کو کرائے پر لے کر ان سے یہ کام کرواتے ہیں۔ موجودہ دور میں زیادہ تر بھکاری کرائے پر کام کرتے ہیں۔ "دو خالی ہاتھ" اور "گستاخ" ایسے افسانے ہیں۔ جن کے کردار بالواسطہ گداگروں کے لیے بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "دو خالی ہاتھ" میں بالواسطہ گداگر کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "وہ کسی بچے اٹھانے والے گینگ کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ جو اسے سورج طلوع ہونے سے بیشتر بھیک مانگنے کے لیے شہر کے کسی پررونق جگہ پر بھیج دیا جاتا ہے اور سورج غروب ہونے کے بعد اس کی تمام دن کی مانگی ہوئی ریزگاری کو چھین کر اس کے عوض اُسے روٹی کا ایک آدھ ٹکڑا تھما دیا جاتا ہو۔" (۱۶)

"گستاخ" میں بھی ایسے ہی بالواسطہ کردار کی کہانی ہے۔ جو بوڑھی عورت سے یہ کام کرواتا ہے۔ اس بڑھیا کی کہانی کچھ یوں ہے۔

”ایک نوجوان بڑھیا کو ہر روز صبح سویرے گاؤں کی بیرونی سڑک کے بارونق چوک پر چھوڑ جاتا اور شام کو جب سورج غروب ہونے کو ہوتا تو بڑھیا کو اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑتا۔ سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بڑھیا یا اپنا دایاں ہاتھ آگے کو پھیلا کر خاموش بیٹھی رہتی اوراس کی غم زدہ آنکھیں دور خلا میں گھورتی رہتی اوراس کے لب ہمیشہ سلے رہتے۔ کوئی آتا اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر کوئی بھاری یا ہلکا سکہ رکھ جاتا لیکن اسے قطعاً کوئی خبر نہ ہوتی وہ تو بس اپنی انجانی سوچوں میں گم رہتی۔“[۱۷]

یہ وہ کہانیاں ہے جو دور حاضر کی جدید ٹیکنالوجی پر ضرب کاری کرتی ہیں۔ حنیف باوانے پسماندہ پیشے سے اسے کردار چنے جو بالکل ہی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ حنیف باوانہ صرف گداگروں کی بات کی بلکہ ان کے جذبات واحساسات کے مناظر بھی پیش کیے۔ گداگر مختلف اقسام کے ہیں۔ ان کی وجہ سے معاشرے میں حق دار گداگر کو حق نہیں ملتا۔ حنیف باوا اپنی کہانیوں سے ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ایسے پسماندہ طبقے کی مدد کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اوراس کے افراد ایسے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۳۔ لکڑہارے / لکڑیاں اکٹھی کرنے والے

لکڑہارا سے مراد لکڑیاں کاٹنے والا یا لکڑیاں اکٹھی کرنے والا، لکڑہارے کے مفہوم کو دیکھیں تو ایسا فرد یا شخص جو لکڑیاں کاٹ کر یا اکٹھے کر کے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ حنیف باوانے اپنی تحریروں میں لکڑیاں اکٹھی کرنے والے پسماندہ طبقے کے حالات و مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس پیشے سے وابستہ لوگوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی تا کہ موجودہ دور کے لوگ ان سے آشنا ہو جائیں۔ حنیف باوا نے جن لکڑہاروں کا ذکر کیا وہ اپنے چولہے کو جلانے کی حد تک لکڑیاں اکٹھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پیشے سے وابستہ لوگ معاشی بد حالی کا شکار ہیں۔ "سوکھے پتے" میں حنیف باوا ایسی لڑکی کی کہانی بیان کرتے ہیں جو اپنے گھر کا چولہا جلانے کے لیے گھر کے آس پاس درختوں کی سوکھی ٹہنیاں اور پتے اکٹھے کرتی ہے:

"اس بچی کے پاس کوئی جھاڑو نہیں تھا۔ وہ ہاتھوں سے ہی پتے اکٹھے کر رہی تھی ۔۔۔۔اس نے بڑی پھرتی سے جگہ جگہ ان سوکھے پتوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھریاں لگا دی تھیں۔۔۔۔

"سگو کی ماں بیٹی ابھی تک نہیں آئی۔ بارش ہونے والی ہے"

"ہاں! میرا بس چلے تو میں بھی نہ جانے دوں۔ لیکن سگی کی ماں اس کم بخت چولہے کا کیا کریں۔" (۱۸)

لکڑیاں اکٹھی کرنے والی عورتوں کے مسائل اور مشکلات بھی اُنہوں نے اپنے افسانوں میں لکھتے ہیں وہ کس طرح اس مشکل کام کو جان پر کھیل کر انجام دیتی ہیں۔ "پچھلے" میں حنیف باوا ایسی ہی بڑھیا کی کہانی بیان کرتے ہیں جو سڑکوں سے پتے اور سوکھے گنے اکٹھے کرتی ہے۔ لیکن یہ سب کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں بلکہ وہ اپنے چولہے سے جڑے افراد کے بارے میں پریشان ہے۔ "پچھلے" کی بڑھیا اس طرح چولہے کا ایندھن تلاش کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ "بڑھیا بس کے نیچے آنے سے بال بال بچ گئی تھی ۔۔۔۔جب اس کی سانسیں اعتدال میں آئیں تو وہ بسوں، کاروں، ٹرکوں اور ٹرالیوں کے پہیوں سے کچلے ہوئے گنے اکٹھے کرنے میں مصروف ہو گئی۔" (۱۹) "چھتر چھاؤں" کی بڑھیا بھی "پچھلے" کی طرح گھر کا چولہا جلانے کی جستجو میں لگی ہے۔ وہ بھی صبح سے لے کر شام تک ایندھن کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے۔ حنیف باوا نے ایسے کرداروں اور پیشوں کا ذکر کر کے ان کی نمائندگی اور انسان دوستی کا کام کرتے ہیں۔ "چھتر چھاؤں" کی کہانی یوں رقمطراز کرتے ہیں:

"میری ماں روزانہ صبح کا کھانا کھا کر گھر سے نکلتیں اور شام کو جب واپس لوٹتیں تو ان کے سر پر ایندھن کی گٹھڑی ہوتی جب وہ اس گٹھڑی کو صحن میں آ کر پھینکتیں تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے سر کا بوجھ نہیں میرے سر کا بوجھ اتارا ہے۔ (۲۰)

یہ ایسا پسماندہ طبقہ ہے جو موجودہ دور میں گیس اور بجلی وغیرہ کے چولہے ہونے کے باوجود ابھی بھی مٹی کے چولہوں کو لکڑیوں کی مدد سے چلانے کی جستجو میں ہیں۔ اس طبقے کے لوگ معاشی بدحالی کا شکار تو ہیں لیکن

معاشرے کی ترقی ان کو مزید پسماندہ زندگی گزارنے پر مجبور کر رہی ہے۔ معاشرے کی حقیقی ترقی اس وقت ہوتی ہے جب تمام افراد مساوی سہولیات سے مستفید ہو رہیں ہوں۔ لکڑیاں اکٹھی کر کے چولہا جلانے والا طبقہ ہمارے معاشرے کا پسماندہ ترین طبقہ ہے۔

۴۔ بھانڈ/مراثی

لفظ میراثی اردو لفظ میراث سے مشتق ہے۔ جس کے معنی وراثت کے ہیں۔ میراثی برصغیر پاک و ہند کی مشہور قوم ہے۔ جو ہندوستان اور پاکستان میں آباد ہے۔ میراثی قوم پیشے کے طور پر رقاص، انساب کی ماہر اور ڈوم قوم ہوتی ہے۔ یہ قوم شجرہ ہائے نسب یاد کرنے میں ماہر ہے۔ برصغیر میں کسی بھی بڑے خاندان کا نسب معلوم کرنا ہو تو ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ان کو ناچ گانے کی محفلوں اور شادیوں کی تقریبات پر بلایا جاتا ہے۔ پاکستان پنجاب میں میراثی قوم تقریبات میں زیادہ تر اچھی تفریح مہیا کرنے اور نوحے یا مرثیہ پڑھنے کے لیے بلائی جاتی ہے۔ دور جدید میں اکثر میراثی موسیقار تھیٹر فنکار بن گئے ہیں۔ پنجاب میں زیادہ تر پنجابی اور اردو زبان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ زیادہ تر کا تعلق پنجاب کے دیہی علاقوں سے ہے۔ ان کے اوصاف میں جگت بازی، گانا بجانا، گلوکاری، بے جا تعریف و توصیف اور حاضر جوابی شامل ہیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ دور جدید میں یہ پیشہ انتہائی پسماندگی میں جا رہا ہے۔ کیوں کہ دن بدن یہ نسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس قوم نے بہت سے خاندانی قبیلوں کی خدمات کی ہیں۔ حنیف باوا میراثیوں کی بقاء اور تحفظ کے لیے اپنی تحریروں میں اقدامات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس پیشے سے وابستہ لوگوں کی پسماندگی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ افسانہ "سارنگی والا" میں ایک میراثی کی کہانی:

> "وہ پیشہ ور سارنگی نواز تھا۔ پیشہ وران معنوں میں کہ وہ گلیوں، بازاروں سڑکوں پر گھوم پھر کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا۔ جب وہ کسی نجی محفل میں بیٹھ کر سارنگی بجاتا تو سننے والے سحر زدہ ہو جاتے۔۔۔وہ اکثر چھوٹے چھوٹے چائے خانوں، چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں میں جاتا وہاں پر موجود لوگ اس سے کسی فلمی گانے یا لوگ گیت کی دھن سنتے جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر چکتا تو اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر چھوٹے بڑے سکے چھنکنے لگتے۔" (۲۱)

"سارنگی والا" میں اللہ دتہ میراثی گلی کوچوں میں جابجا جاکر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس پیشے کی پسماندگی کی وجہ سے یہ خاندان ہمارے معاشرے کے گلی کوچوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ دور، قدیم میں یہ خاندانوں امراء کے محفلوں کی زینت ہوا کرتا تھا۔ حنیف باوا "سارنگی والا" کے علاوہ "کھنگی"، "مانگے سے عشق نہیں ملتا" اور نشئی "وغیرہ میں میراثیوں کے مسائل اور فن کے بارے میں بتاتے ہیں۔ انہوں نے دور جدید میں نئی نسل سے ان کی آشنائی کروانے کی کوشش کی ہے۔

۵۔ موچی

موچی سے مراد جوتوں کی مرمت کرنے والا یا نئے جوتے بنانے والا، ہمارے معاشرے میں جوتوں کی مرمت اور چمڑے کے نئے جوتے موچی بناتے ہیں ۔ یہ ہماری ثقافت کا حصہ ہے۔ لیکن دور جدید میں یہ پیشہ اور اس سے وابستہ لوگ پسماندگی کی زندگی بسر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ پاکستانی معاشرے میں خاص طور پر دیہاتوں میں کمیوں کا رواج عام ہے۔ دیہات کے لوگ نائی، لوہار، بڑھائی، اور موچی وغیرہ کو اپنا کمی رکھتے ہیں ۔ ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے میں حقیقت نگاری کا رجحان پیدا کیا ۔ اس کے ساتھ معاشرے کے تمام موضوعات کو افسانوں میں بیان کرنے کی روایت قائم کی۔

بقول ڈاکٹر پروین اظہر

> "ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں نے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر نئے نئے موضوعات کا احاطہ کیا۔ جن میں ملکی غلامی، طبقاتی کشمکش، افلاس، سماجی انتشار، قومی اتحاد، امن، خواہش، متوسط طبقے کی اخلاقی اقدار کا کھوکھلا پن، بیکاری، گھٹن، ایثا و قربانی کی لگن، خاندانی زندگی کی ابتری، فرقہ پرستی، رجائیت پسندی ایسے کتنے ہی موضوعات کو مختلف کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔" (۲۲)

نچلے طبقے سے جن پیشوں کا ذکر باوا کے یہاں ملتا ہے۔ وہ ایسی تحریک کی پیداوار ہیں۔ ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کو نقد رقم دینے کی بجائے فصل کی کٹائی پر فصل کا کچھ حصہ دیا جاتا ہے۔ اس پیشے سے جڑے لوگ آج کے دور میں بھی ان لوگوں کے غلام ہیں۔ ان کے پاس نہ تو اپنا گھر ہوتا ہے نہ ہی کوئی

مستقل ٹھکانا۔ یہ لوگ دیہات کے نمبرداروں کی مرہون منت سر چھپانے کے لیے جگہ حاصل کرتے ہیں۔ حنیف باوا اپنی تحریروں میں موچی کے پیشے سے وابستہ لوگوں کی مشکلات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایسا پسماندہ طبقہ ہے جو محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن معاشرہ ان سے سوتیلی ماں جیسا سلوک کرتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ گاؤں کے نمبردار کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تقدیر کا فیصلہ ان (نمبرار) کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ "شبنم سے دھلا دل" ایسا ہی فسانہ ہے جس میں اس پیشے سے وابستہ کردار کی کہانی ہے۔ جس کا استحصال اس گاؤں کا نمبردار اس طرح کرتا ہے۔

”وہ گھر دتو موچی کا تھا۔ دتو موچی چودھریوں کے عقب میں ایک کچے مکان میں رہتا رہتا تھا۔ محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ ایک روز چودھریوں کو اپنی حویلی کو مزید وسیع کرنے کا خیال آیا تو فوراً انہوں نے دتو موچی کو اپنے ڈیرے پر بلاوا بھیجا۔ دتو سہا سہا سا ان کے ڈیرے پر گیا اور بڑے چوہدری کی پیڑھی کے دائیں پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔

"اوئے دتو ہم تمہارا کوٹھا لینا چاہتے ہیں۔ بول دیتا ہے کہ نہیں"

دتو اپنے کوٹھے کے بارے میں یہ سن کر کانپ گیا یا اور کہنے لگا چودھری جی۔۔۔ ایسا نہ کریں میں اجڑ جاؤں گا اور پھر میرے بچے کہاں جائیں گے۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا تیرے بچوں کو۔۔۔ شام تک یہ مکان خالی ہونا چاہیے بس۔“ (۲۳)

اس تحریر سے موچی کا استحصال واضح ہو جاتا ہے۔ حنیف باوا نے نہ صرف اس پیشے سے وابستہ کردار پیش کیے بلکہ ان کے حالات زندگی بھی بیان کی ہے۔ اس پیشے کی پسماندگی اور اس سے جڑے لوگ دور جدید میں اپنے آباء کے پیشے کو اپنا کر نالاں ہیں۔ کیونکہ اس دور میں وہ اس پیشے سے اتنی رقم نہیں حاصل کر سکتے جس سے ان کا گزر بسر ہو جائے۔ "موچی بابا" اور "وہ ایک شخص" ایسے افسانے ہیں جن کے کردار اس پیشے سے چھ دہائیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کے شروع سے یہ پیشہ زوال کا شکار ہے۔ لوگ جوتوں کی مرمت کرانے کی بجائے نئے جوتے خرید لیتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ معاشی بدحالی کا شکار ہیں۔ جہاں معاشروں

کی ترقی لوگوں کے لئے سود مند ہوتی ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کے لئے وبالِ جان بن جاتی ہے۔"موچی بابا" میں اس پیشے سے جڑے کردار کی کہانی کو حنیف باوا کے بقول:

"اس گٹر کے بائیں جانب ایک موچی بیٹھا تھا۔ جس کے پاس ایک صندوقچی ہوتی تھی۔ جس میں پرانے جوتوں کے چمڑے، چھوٹی بڑی میخوں کی زنگ خوردہ ڈبیاں، دو تین اوزار دائمی مرض میں مبتلا مریضوں کی طرح پڑے رہتے تھے۔۔۔یہ ایک پھٹی پرانی گدی کے اوپر بیٹھا ہوتا تھا۔ حالانکہ اب یہ گدی اس قدر بوڑھی ہو چکی تھی کہ اب وہ کسی بھی قسم کا آرام پہنچانے سے قاصر تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ضعیف العمری کی وجہ سے اتنا زیادہ کام نہیں ملتا تھا۔" (۲۴)

اُنہوں نے اس قسم کا ایک اور خاکہ "وہ ایک شخص" میں بھی بیان کیا ہے۔ جس میں افسانے کا مرکزی کردار پیشے کے لحاظ سے موچی ہے۔ لیکن عمر اور پیشے کی پسماندگی کا شکار ہے۔'وہ ایک شخص "اور" موچی بابا "کے کردار ضعیف العمری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس پیشے کی پسماندگی کی وجہ سے پریشان نظر آتے ہیں۔ حنیف باوا"وہ ایک شخص"میں موچی بابا کا خاکہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

"اچانک میری نظر ایک موچی پر پڑی۔اس موچی نے اپنے لئے ایک غلیظ سی پھٹی پرانی چادر بچھا رکھی تھی۔ جس پر اس نے ایک صندوقچی رکھی تھی۔اس میں اس نے چھوٹے بڑے چمڑے کے ٹکڑوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اس کے سامنے چٹائی پر ہی اس کے اور اوزار پڑے تھے۔وہ موچی ضعیف العمر تھا۔" (۲۵)

وہ اس پیشے سے وابستہ افراد کی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان کے حالاتِ زندگی اور کام نہ ملنے کی صورت میں پریشانی کو بھی بیان کیا ہے۔اس پیشے کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر اس پیشے اور افراد کی ترجمانی کی ہے۔اس پیشے کے افراد آج یعنی دور جدید میں اپنے ہی پیشے سے روزی کمانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آباء کے ہنر کو اگلی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ہنر کی اگلی نسل میں منتقلی کی وجہ سے ان کو کس حد تک پسماندہ زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔اس پیشے سے متعلق جو مشکلات ہیں حنیف باوا ان کو اپنے افسانوں میں اس پر بات کرتے ہیں۔

۶۔ گھسیار

اس سے مراد ایسے افراد جو گھاس کو کاٹ کر بیچتے ہیں یا اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق زیادہ تر دیہی علاقوں سے ہوتا ہے۔ اس پیشے سے جڑے زیادہ تر افراد گھاس کو بیچ کر اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا پیشہ ٹانگوں کے اڈے سے وابستہ تھا۔ یہ لوگ ٹانگوں کے اڈے پر گھاس بیچ کر اپنے روزمرہ استعمال کی چیزیں خریدتے ہیں۔ لیکن دور جدید میں ٹانگوں کا پیشہ ناپید ا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یہ افراد بے روزگار ہو رہے ہیں۔

اُنہوں نے اس پیشے سے وابستہ افراد کی کہانیاں بھی اپنے افسانوں میں بیان کی ہیں۔ یہ پسماندہ طبقہ اب اس کرہ ارض سے ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن حنیف باوا نے اپنی تحریروں کے ذریعے نئی نسل کو اس پیشے سے وابستہ لوگوں سے شناسائی کروائی ہے۔ "دُود زدہ آدمی" میں حنیف باوا ایسے ہی گھسیارے کی کہانی بیان کرتے ہیں جو بارش کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتحال سے پریشان ہے۔ کیونکہ اس کی گھاس والی گٹھڑی بارش میں بھیگ جانے سے فروخت نہیں ہو سکتی تھی:

> "بابا کرم الٰہی گھاس کی گٹھڑی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ پاؤں میں ادھڑے ہوئے چھتر تھے۔ جو اس کے سوکھے پاؤں کی پکڑ میں آنے سے گریزاں تھے۔۔۔۔۔ کالی گھٹا جو بابے کی پچھلی مسافت کے آخری کونے سے اٹھ تھی۔ اب اس کے سر پر آ پہنچی تھی۔ جب کالی گھٹا نے انگڑائی لی اور پھر جب بجلی چمکی تو بابے کرم الٰہی کا تمام وجود لرز سا گیا۔
> "یا خدا! آج کا دن گزر جانے دے۔ آج مجھے یہ گٹھڑی پہنچانے دے کل بے شک۔
> (۲۶)

اُنہوں نے نہ صرف بابا کرم الٰہی کی خدا سے کی جانے والی کل کی التجا کو پیش کرتے ہیں بلکہ معاشرتی نظام سے پیدا ہونے والے طبقات کو کوستے ہیں۔ کیونکہ معاشرے کے کچھ لوگ بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن بابا کرم الٰہی اپنی جمع پونجی یعنی گھاس کی فکرمندی سے خدا کے دربار میں اپنی عرض پیش کر رہا تھا۔ ایسا پسماندہ طبقہ زندگی سے لطف اٹھانے کی بجائے اپنے پیٹ کی بھوک کو بجھانے میں مصروف ہے۔" دُود زدہ

آدمی" کی طرح "گھاس کی گٹھڑی " میں حنیف باوا ایسی ہی بوڑھی عورت کی کہانی بیان کرتے ہیں ۔جو پیشے کے لحاظ سے گھسیاری ہے اس لیے گٹھڑی کو بڑھاپے کا سہارا سمجھتی ہے۔ یہ گٹھڑی اس وقت سے ساتھ نبھاتے چلی آرہی ہے جب سے اس نے اپنے تمام ارمان اور ساری خواہشات کا گلا گھونٹ کر زندگی گزارنے کی قسم کھائی تھی۔ مائی پھجاں بچپن سے والدین کی شفقت سے محروم ہو گئی تھی ۔ساری عمر اکیلے ہی گزار دی۔ گھر کا چولہا جلانے کے لیے آس پاس کے کھیتوں سے گھاس کاٹی اور دیہات کے اڈے پر بیچ کر کچھ پیسے کماتی۔ یہ پیسے اس کے گزر بسر کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ لیکن ایک دن بارش سے پیدا ہونے والی صورتحال نے اس کو کس حد تک پریشان کیا حنیف باوا لکھتے ہیں کہ

> "مائی پھجاں ٹانگوں والے اڈے پر گھاس فروخت کر کے پیسے وصول کرتی ہے وہ انہیں اپنی پھٹی پرانی چادر میں پانچ سات گرہیں دے کر ایسے باندھتی ہے جیسے اُسے ان پیسوں کے اُڑ جانے کا خدشہ ہو۔۔۔۔ یہ بارش برسنے لگ جائے۔ اگر یہ بادل برس پڑا تو میری گھاس کی گٹھڑی کا کیا بنے گا یہ بھیگ جائے گی ۔ نہیں یہ بھیگنی نہیں چاہیے۔۔۔۔ بارش مزید کتنی دیر برستی۔ آخر اس نے رکنا تھا وہ رک گئی۔ مائی پھجاں کی گٹھڑی بھیگ گئی ۔ اس بھیگی ہوئی گھاس کو دیکھ کر اس کا دل غمگین ہو گیا۔ شاید اب گھاس نہ بک سکے گی۔" (۲۷)

وہ "گھاس کی گٹھڑی "اور "دودزدہ آدمی" میں اس پسماندہ طبقے کے افراد کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ اس گٹھڑی سے جڑے ارمان اور خواہشات کی دکھ بھری داستان بھی بیان کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں اس طرح کی کہانیاں بیان کرنا حنیف باوا کا حب الوطنی کا جذبہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایسا پسماندہ طبقہ ہے جس کو موجودہ دور قبول نہیں کرتا۔ لیکن حنیف باوا نے ان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ حنیف باوا ان کی خواہشات اور ارمان جو گٹھڑی سے جڑے ہیں ان کو بھی عیاں کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

۷۔ مزدور

اس سے مراد ایسے افراد جو محنت کر کے / دیہاڑی کر کے پیسے حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ محنت کش طبقہ ادنیٰ طبقے میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو مزدوری کی تلاش میں دربدر جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کام ملتا ہے کبھی خالی ہاتھ گھر لوٹنا ان کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اپنے عالمی دن (یوم مزدور) پر بھی محنت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا عالمی دن اعلیٰ اور متوسط طبقہ منا رہے ہوتے ہیں۔ حنیف باوا اس طبقے کی داستان بھی اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ طبقہ کام نہ ملنے کی صورت میں کس حد تک پریشانی کے عالم میں زندگی بسر کرتا ہے۔ "نہر کی پٹڑی" میں وہ ایسے ہی کردار کی کہانی بیان کرتے ہیں جو مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے خالی ہاتھ پیٹ اور جیب گھر لوٹ رہا ہے۔ گھر لوٹتے وقت وہ بہت سی خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن کام نہ ملنے کی صورت میں وہ ان خواہشات کی تکمیل نہ کر سکا۔

> ”وہ اپنے گاؤں سے دس بارہ میل بھٹے پر کام کرنے کے لئے آیا تھا لیکن وہاں اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا اس کی جیب اور پیٹ دونوں خالی تھے۔ وہ مایوسی کے عالم میں اپنے مسافت کم کئے جا رہا تھا۔۔۔ جب اس نے گاؤں کی دائیں طرف کا موڑ عبور کر کے اپنے مکان کے صحن میں قدم رکھا تو اس کے بچے اس کی طرف لپک پڑے۔
>
> "ابا میرے لئے لڈّو نہیں لائے؟"
>
> "میرے لیے برفی۔۔۔۔"
>
> "میرے لیے چھوٹی سی گڑیا کیوں نہیں لائے؟"
>
> تمام بچوں کے مطالبات سن کر وہ کہنے لگا۔ کل تمہارے لئے سب چیزیں لا دوں گا۔ [۲۸]

یہ طبقہ اپنی خواہشات کو پس پردہ رکھ کر اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ اس طبقے کی خواہشات تو بس کام کی ہے اگر کام مل جائے تو اپنی اور بچوں کی خواہشات کو بآسانی پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ محنت کش طبقہ ان ارمانوں کی تکمیل کے لیے جان تک دیتا ہے۔ "چھتری" میں حنیف باوا ایسے ہی کردار کی عکاسی کرتے ہیں جو محنت

مزدوری کرتا ہے۔ جو اپنی حلال کی کمائی سے اپنی بیوی اور بچوں کو دو وقت کا کھانا کھلاتا ہے۔ اس طبقے کے پاس سر چھپانے کے لیے کچا مکان اور زندگی گزارنے کے لئے پختہ دل ضرور ہوتا ہے۔ ان کا تمام سرمایہ بیوی بچے ہیں۔ "چھتری" کا روشن ایسے ہی ایک گھر کا سرمایہ تھا۔ لیکن ایک دن مزدوری کرتے ہوئے اس کی موت واقع ہو گئی حنیف باوا لکھتے ہیں۔ "وہ مستری کے ساتھ ایک عمارت کی دوسری منزل پر کام کر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پیڑ سے اچانک پھسلا اور وہ زمین پر آ گرا اور گرتے ہی موت نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔" [۲۹] یہ محنت کش افراد اس طبقے سے ہیں جن کا کل سرمایہ ایک دن کی اجرت ہے۔ روشن کے مر جانے کے بعد اس کی بیوی بچوں پر کیا گزری اس سے ہمیں اور معاشرے کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خوشید عالم اپنی کتاب "اردو افسانے میں گاؤں کی عکاسی" میں مزدوروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ کردار خون اور پسینہ بہانے والے محنت کش لوگ ہیں ۔ ان کے روزمرہ کا پیہم عمل در حقیقت انسانی محنت کو ہی سامنے نہیں لاتا بلکہ ان آویزشوں کو بھی سطح پر نمایاں کرتا ہے جو حاصل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور درونِ دل تلاطم مہیا کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں اردو افسانوں میں گاؤں کی مناسب نمائندگی نہیں دی گئی۔" [۳۰]

کیونکہ طبقاتی کشمکش والا معاشرہ ایسے افراد سے نہیں بنتا ہے۔ حنیف باوا اپنی تحریروں میں اس طبقے کو پیش کر کے انسان دوستی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ روشن کی موت کے بعد اس کے گھر والوں پر کیا گزری اس کو بھی حنیف باوا بیان کرتے ہیں۔ اس طبقے کی کہانیاں معاشرے کی ہمسفر ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر معاشرہ ادھورا ہے۔

۸۔ دیوانے

دیوانہ ایسا شخص ہوتا ہے جو دماغی مرض میں مبتلا ہو۔ یہ عام انسانوں کی طرح سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ ان کے حواس میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ انہیں پاگل اور دیوانے کا لقب دیتا ہے۔ ایسے افراد دوسروں کے لیے مسخرے پن کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں ۔ کیونکہ یہ

افراد ذہنی صلاحیت سے لاچار ہیں۔ اس لئے یہ افراد معاشرے کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس طبقے کے کچھ لوگ پیدائشی اور کچھ معاشرے کی ناانصافیوں کی وجہ سے دیوانے ہو جاتے ہیں۔اُنہوں نے ایسے لوگوں سے کچھ کردار لے کر اپنی کہانیوں کو منزل پر پہنچاتے ہیں۔ " زنجیر سے بندھا وجود" کا مرکزی کردار ایک نیم پاگل عورت ہے۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے لیکن معاشرے کے افراد ان سے بے رحمی کا سلوک کرتے ہیں۔ معاشرہ اس کے احساس سے قاصر ہے۔ یہ لوگ تھوڑی سی توجہ پر خوشیوں بھری زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ حنیف باوا:

”وہ نیم پاگل عورت پِھرتی پھَراتی وہاں آنکلی۔اس نے پانی سے بھرے کولر کو دیکھا اور وہیں بیٹھ گئی۔ پہلے اس نے گلاس کو پکڑا کولر کی ٹوٹی کھولی۔۔۔ پھر اس گلاس کو کولر سے الگ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ ابھی اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی کہ دکان کا ایک نوکر جو گاہکوں سے خندہ پیشانی سے پیش آرہا تھا اس پاگل عورت کو یہ حرکت کرتے دیکھ کر چیخ اٹھا۔

"ارے۔۔۔۔ارے۔۔۔۔کیا کرتی ہے۔ چل بھاگ جہاں سے"

دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس پاگل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔“ (۳۱)

پاگل عورت کو دھتکارنا معاشرتی المیہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے افراد توجہ طلب ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ "کی جاناں میں کون" کی کہانی انو کے گرد گھومتی ہے۔ جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہونے کے ساتھ ساتھ پاگل بھی ہے۔" کی جاناں میں کون "اور" زنجیر سے بندھا ہوا وجود" ایسے افسانے ہیں جن کے کردار پاگل تو ہیں لیکن افراد کے دھتکارے جانے کی وجہ سے سے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "کی جاناں میں کون" میں حنیف باوا ایک دیوانے لی کہانی پیش کرتے ہیں:

”وہ لوگ اس سے یوں نفرت کا اظہار کرتے:

"نہ جانے ہر روز یہ پاگل کہاں سے آجاتا ہے۔ جیسے دیکھتے ہی ابکائی آنے لگتی ہے۔ ہش پرے ہٹ، کپڑے میلے کرے گا کیا؟"

> وہ ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بس ان کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر سہم جاتا بعض اوقات تو ان لوگوں کی نفرت اتنی شدید ہوتی جسے دیکھ کر وہ رونا شروع کر دیتا۔[۳۲]

اُن کے افسانے نہ صرف ان پاگل کرداروں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں بلکہ ان پاگلوں کے احساسات و جذبات کی منظر کشی بھی کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بہت سے افسانوں میں ایسے کرداروں کو جنم دیا کیا ہے کیونکہ یہ طبقہ بھی معاشرے کا حصہ ہے ان کو نظر انداز کرنا ان کے ساتھ نا انصافی ہے۔ اس لئے حنیف باوا "باہر کا آدمی"، زنجیر سے بندھا ہوا وجود"، "ایک تھا حاکم "اور" کی جاناں میں کون " افسانوں میں ان کرداروں کی مدد سے کہانی پیش کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر انور سدید "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش" میں نچلے طبقے کے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہیں ۔" نچلے متوسط طبقے کے لوگ کسان ، مزدور، محنت کش ، گھسیار، گڈیے، بھنگی اور ماشکی وغیرہ ہیں ۔ اور یہ مثالی حد تک اچھے کردار کے مالک ہیں جبکہ کہ طبقہ امراء کے بیشتر کردار معاشرے کے بدنما داغ ہیں۔"(۳۳) حنیف باوا اپنے افسانوں میں ایسے پسماندہ طبقے کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے افسانوں میں تقریباً تمام قسم کے پسماندہ کردار نظر آتے ہیں۔

۹۔ ملازمت پیشہ طبقہ

اس سے مراد وہ شخص جو نوکری پیشہ ہو یا کسی سرکاری یا نجی محکمے میں کام کرنے والا۔ ملازمت بھی لوگوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیتی ہے۔ کیونکہ تعلیمی قابلیت کی وجہ سے نوکری حاصل کی جاتی ہے ہر افراد کو اس کی تعلیم کے مطابق نوکری دی جاتی ہے۔ ان افراد کی تقسیم گریڈ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً گریڈ ۱۷ سے ۲۲ تک اعلیٰ طبقہ گریڈ ۱۱ سے ۱۶ تک متوسط طبقہ اور گریڈ ۱ سے ۱۰ تک پسماندہ طبقہ کہلاتا ہے۔ حنیف باوا نے اپنے افسانوں میں پسماندہ نوکری پیشہ افراد کے حالاتِ زندگی کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایسا کردار ہیں جو پسماندہ نوکری پیشے سے تعلق رکھتے ہیں ۔" آخری پڑاؤ کا مسافر" ایسا افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار گریڈ چار کی نوکری سے ریٹائر ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی نوکری سے اپنے کنبے کی کفالت کرتا ہے۔ لیکن

نوکری سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہی خاندان مطلب بچے اس سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے اس کے بارے میں حنیف باوا یوں رقم طراز ہیں:

"اُس کے بچوں نے نہ جانے کیوں اسے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ اب بھی ان کا وہی والد تھا۔ جس نے کہ اپنی چھوٹی سے ملازمت میں رہتے ہوئے اپنی قلیل سی تنخواہ میں انہیں پال پوس کر جوان کیا، انہیں پڑھایا لکھایا اور جب تک وہ کسی کام کے نہیں ہو گئے تھے اس نے اپنا پیٹ کاٹ کر ان کی شکم پروری کی ۔۔۔۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے چولہے کے قریب کھانا کھا رہا تھا۔ اسی دوران بڑے بیٹے نے پہلے اپنی بیگم رضیہ کی جانب بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر نہ جانے کیا سوجھی اس نے بڑے ہی ترش لہجے میں اس سے کہا۔

"ابا جی !اب آپ یہاں بیٹھ کر کھانا نہ کھایا کریں۔ اب کھانا اور ضرورت کی دوسری چیزیں آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچ جایا کریں گے۔" (۳۴)

ایسی پسماندہ نوکری سے حاصل ہونے والی رقم سے یہ افراد اپنے گھر کا چولہا جلاتے ہیں۔ یہ افراد محنت زیادہ اور رقم کم ملنے سے نالاں تو ہیں لیکن موجودہ دور میں نوکری ان کے لیے کسی خزانے سے کم نہیں۔ کیونکہ یہ نوکری ہمیشہ کے لئے ان کا سہارا بن جاتی ہے۔ "بوڑھا شرفو" کا مرکزی کردار بھی ریٹائر ہے۔ وہ اپنی کم سی پینشن سے گھر کا چولہا جلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن موجودہ دور میں یہ پیسے بہت کم ہیں جن سے گزر بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ بڑھاپے میں انسان اولاد سے زیادہ دواؤں کے سہارے جیتا ہے۔ اولاد بھی والدین سے زیادہ پیسوں کی طلب گار ہوتی ہے۔ بوڑھے شرفو کی کہانی:

"بوڑھا شرفو اپنی ریٹائرمنٹ کے ایک سال بعد اپنی ایک ماہ کی پینشن لے کر گھر آیا تھا ۔ یہ پینشن حاصل کر کے وہ بہت خوش تھا۔۔ جیسے ہی شرفو دروازے کی دہلیز پار کر کے صحن میں پہنچا تو اس کا بیٹا غفور بھاگ کر گھر سے باہر نکلا اور آتے ہی اپنے باپ سے مخاطب ہوا۔

"پینشن لے آئے ابا" غفورے نے اور کوئی بھی بات کرنے سے پہلے یہ سوال داغ دیا۔

"ہاں لے آیا" شرفو نے بڑے شوق سے کہاَ

"لاؤ یہ تمام پیسے مجھے دے دو"

یہ سن کر شرفو کو پت جھڑ کے اس پتے کی طرح محسوس کرنے لگا جو راستے میں پڑا ہر آنے جانے والے کے پاؤں کی ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا۔

"(۳۵)

اُنہوں نے اس قسم کی مشکلات کو پیش کر کے پسماندہ نوکری پیشہ افراد کی ترجمانی کی ہے۔ یہ ایسے کردار ہے جو معاشرے میں بے نام ہی موت سے جا ملتے ہیں۔ " آخری پڑاؤ کا مسافر" اور " بوڑھا شرفو" ایسے ہی دو یٹائرڈ افراد ہیں جو تمام عمر نوکری کر کے اولاد کی پرورش کرنے میں مصروف رہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی کم آمدنی کی وجہ سے وہی اولاد نفرت کرنے لگتی ہے۔ اُنہوں نے ہر پسماندہ طبقے کو اپنے افسانوں میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کردار معاشرے کے پسماندہ ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۱۰۔ محنت کش عورتیں

اس سے مراد ایسی عورتیں جو گھروں اور کھیتوں میں کام کرتی ہو ں ۔ دور حاضر میں گھر کا نظام چلانے کے لئے پسماندہ طبقے کی عورتوں کو گھروں اور کھیتوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ جس سے وہ کچھ پیسے حاصل کرتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں عورت محنت تو زیادہ کرتی ہے لیکن اجرت مرد کی نسبت کم ملتی ہے۔ پسماندہ طبقے کی عورتیں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنا گزر بسر کرتی ہیں ۔ وہ اپنے افسانوں میں ایسی عورتوں کا ذکر کیا ہے جو تعلیم کے زیور سے محروم ہیں اس لئے لوگوں کے گھروں اور فصلوں کی کٹائی کر کے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ "مانگے سے عشق نہیں ملتا" کی مائی رجو اڈھیر عمر کی عورت ہے۔ لیکن وہ اپنا گزر بسر کرنے کے لئے گندم کی کٹائی کر رہی ہے۔ یہ محنت کش عورت گندم کی کٹائی مشین کی طرح کرتی ہے۔ لیکن بڑھاپے نے یہ سب کچھ اس سے چھین لیا ہے۔ "جب کٹائی کا موقع ہوتا تو جیسے اس کی خوشی کی انتہا نہ رہتی۔ جب کھیتوں میں پہنچ کر ہاتھ میں داتری پکڑے ی تو بڑے بڑے گھبرو اس کے مقابلے میں ڈرتے تھے۔ وہ ڈھیروں گندم کاٹ کر رکھ دیتی۔" (۲۸)

پسماندہ طبقے کی زیادہ تر عورتیں شوہر کے فوت ہو جانے یا طلاق کی صورت وغیرہ میں کام کاج کر کے اپنے بچوں کو پالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسی عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کے لئے کوئی خاص نظام موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ عورتیں محنت مزدوری کر کے باقی زندگی کو گزارنے کی جستجو کرتی ہیں۔ پسماندہ طبقے کی ایسی عورتیں خوددار اور ایماندار ہوتی ہیں۔ یہ خود اور بچوں کو رزق حلال کھلانے کی کوشش کرتی ہیں ۔"ادھورے ہاتھ" ایسی عورت کی کہانی ہے جو شوہر کی وفات کے بعد لوگوں کے گھروں میں کام کر کے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ یہ عورت کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے اور بھیک سے ملے پیسوں پر گزر بسر کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ہے حنیف باوا لکھتے ہیں:

"اُس کا شوہر ان تین بچوں کو ان کی چھوٹی عمر میں ہی چھوڑ کر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی ماں نے صاحبِ حیثیت لوگوں کے گھروں میں پوری ایمانداری اور فرض شناسی سے کام کر کے انہیں پال پوس کر بڑا کیا۔" (۳۶)

وہ پسماندہ طبقے کی عورتوں کے ایسے کردار تخلیق کرتے ہیں ۔جو ہاتھ کی محنت سے بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ ایسے کردار دورِ حاضر یعنی عصر میں کسی پر بوجھ بننے کی بجائے خود محنت سے معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے کرادر نوجوان نسل کے اندر اعتماد اور خودداری پیدا کرتے ہیں ۔"چھتری " بھی ایسی عورت کی کہانی ہے جو جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہے لیکن اپنی خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بچوں کی پرورش کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ مرد کی وفات کے بعد بیوی کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ وہ گھر بیٹھ کر بچوں کی پرورش کر سکے۔ حنیف باوا روشن کی وفات کے بعد نوراں کے حالات کے بارے میں بتاتے ہیں:

"اُس نے اِدھر اُدھر لوگوں کے ہاتھوں کی طرف جھانکنے کی بجائے اپنے اندر اعتماد پیدا کیا۔ اب اس نے کسی بھی قسم کی محنت کو عار نہ سمجھا، کاٹنے کو سوت مل گیا سوت کات لیا سوت نہ ملا لوگوں کے برتن مانجھ لیے، گوہا کوہاڑ کر لیا، لوگوں کے ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈال دیا، ساہنی کر دی، فصل کے موقع پر فصل کاٹ لی۔ اس نے اپنے دو پھول جیسے بچوں کے لئے جو کام بھی میسر آیا کر لیا۔" (۳۸)

"چھتری" اور "ادھورے ہاتھ" کی عورتیں بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کے لئے محنت کرتی ہیں۔ یہ محنت کش عورتیں جو کام ملے اس کو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔ڈاکٹر عائشہ سلطانہ "مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ" میں عورت کی جوانمردی اور خودداری پر یوں رقم طراز ہیں: "عورت کی سماجی وسیاسی نیز معاشی حالت ترقی پذیر ہے۔ عورتیں معاشی طور پر خود کفیل ہیں اور وقت پڑنے پر مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ موجودہ عورت میں خود اعتمادی اور خودداری جیسے بیش بہا جذبات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔"(۳۹) معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ حنیف باوا دور حاضر کے اہم مسائل کو جو پسماندہ طبقے کو پیش ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ حب الوطنی اورانسان دوستی کا تقاضا ہے کہ ملکی مسائل کو اجاگر کیا جائے۔ حنیف باوا پسماندہ طبقے کے نمائندہ لکھاری ہیں۔

۱۱۔ مفلوک الحال ادیب

اس سے مراد ایسا شخص جو معاشی حوالے سے خستہ حال یا تباہ حال ہو ،مفلوک الحال ادیب سے مراد ایسا ادیب جو ادب میں نمایاں کارنامے سرانجام دینے کے باوجود بھی معاشی بدحالی کا شکار ہو۔ کیونکہ ایک ادیب کی پہلی ترجیح ادب ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ دولت کمانے اور خود کو معاشی حوالے سے بہتر کرنے کے لیے وقت نکالے۔ اس لیے زیادہ تر ادیب مفلوک الحالی کی زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں ۔ ایسے ادیب اپنی تحریروں میں تلخ حقیقت بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آصف فرخی اپنے ایک انٹرویو میں مفلوک الحال ادیب کے بارے میں بتاتے ہیں ان کے بقول

> "اصل میں ادیب کے مفلس ہونے یا مفلوک الحال ہونے کا تصور رومانوی ہے۔۔۔
> ایک ادیب کو ایک ادیب کی طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ کیونکہ اس کی پہلی ترجیح میں
> ادب ہوتا ہے۔ اور ادب کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ مال کمانے یا
> اپنے آپ کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کے لیے وقت نکالے۔" (۴۰)

بہت سارے ادیب ایسے ہیں جو قلم کے ذریعے روزی روٹی کمانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا معاشرہ ان سے یہ حق بھی چھین لیتا ہے۔ ایسے ادیب اپنے نظریے پر کاربند ہو کر ادب لکھنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے رویے اور معاشی

آسودگی کی وجہ سے یہ دوہرے نظریے کے مطابق لکھ رہے ہوتے ہیں۔ حنیف باوا بھی مفلوک الحال ادیبوں کی فہرست کا نمایاں نام ہیں۔ انہوں نے کسمپرسی کی زندگی بسر کر کے اپنی کہانیوں کو حقیقت نگاری سے لبریز کیا ہے۔ اُن کی تحریروں میں جابجا مفلوک الحالی کی جھلک نظر آتی ہے۔ "لبڑی کولی" حنیف باوا کی مفلوک الحالی کا نمائندہ افسانہ ہے۔ حنیف باوا لکھتے ہیں۔ ”وہ ایک کہانی نویس تھا۔ بہت بڑا بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا۔ وہ جتنا بڑا کہانی کار تھا۔ اتنا ہی اس کا کمرہ چھوٹا تھا۔ اس کی کچی دیواروں اور سرکنڈے کی چھت والے کمرے میں تین پختہ لکڑی کی الماری پڑی ہوئی تھیں۔“ (۴۱)

اس طرح مفلوک الحال ادیبوں کی عکاسی " دروازہ کھلا ہے " میں کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں اپنے خستہ حال کمرے ، ٹوٹی ہوئی الماریوں اوراس میز کی کہانی بتاتے ہیں۔ جس پر وہ ادب کے شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”میں اپنے اس پرانے مکان کے خستہ حال کمرے میں رہتا تھا۔ یہی میرا سونے کا کمرہ تھا۔ یہی بیٹھک تھی ،یہی دارالمطالعہ جس میں یہ دو بڑی الماریاں تھیں جو سدا خوبصورت کتابوں سے بھری رہتی تھیں۔ جو کتابیں میرے مطالعے میں رہتی تھیں وہ ہمیشہ اس ٹوٹی ہوئی میز پر پڑی رہتی تھیں“ (۴۲)

ادب اورادیب کا تعلق ابد سے ازل تک کہ رہے گا۔ ادب اورادیب کا تعلق چولی دامن کا ہے۔ ادب ہی معاشرے کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ حنیف باوا مفلوک الحال ادیبوں کی منظر کشی کرتے ہیں۔ ادیبوں کی مفلسی اور لاچاری ہی اچھا ادب تخلیق کرواتی ہے۔ محمود شام مضمون "پرانی صحبتیں یادآرہی ہیں" میں ادیبوں کے طبقات کے بارے میں بیان ہیں۔"ادیبوں میں بھی طبقاتی اونچ نیچ موجود ہے۔"گھر پیارا گھر "اور" دھند میں گھری کتاب" اس کیفیت کی عکاسی ہیں۔"(۴۳)" گھر پیارا گھر " میں ایسے ہی ادیب کی کہانی ہے۔ جو مفلسی کی زندگی بسر کررہاہے۔ لیکن اس کی کہاناں آفاق گیر اہمیت کی حامل ہیں۔ جب شہرت کی وجہ سے ایک اخباری نمائندہ انٹرویو کے لیا آتا ہے تو "گھر پیارا گھر " میں حنیف باوا لکھتے ہیں:

"ایک بھرپور نظر میرے مکان کے بیرونی حصے پرڈالی ۔جس کی دیواروں پر سے اکھڑی ہوئی لپائی دنیاکانقشہ پیش کررہی تھی۔

لطیف صاحب !"آپ ایسے خستہ حال کمرے میں بیٹھ کر اتنی اچھی کہانیاں کیسے لکھ لیتے ہیں " (۴۴)

"خودسے مکالمہ "،" وہ کون تھا "،"چھترچھاؤں"،" جی سر"اور "دھند میں گھری کتاب "وغیرہ بہت سے کہانیوں میں وہ مفلوک الحال ادبیوں کے معاشی حالات قلم بند کرتے ہیں۔ کیونکہ ادیب ہی اپنے قلم سے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ آمریت اور حکومتی پابندیوں کے دوران ادیب اشاروں کنایوں اور علامتوں کا استعمال کرتے ہیں ۔ یہ روایت ادب میں جبر وظلم سے بننے والی انگریزی دور میں عروج پر تھی۔ افسانے کی روایت میں اس کا آغاز پریم چند کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ بقول انور سدید۔ "پریم چند کے یہاں جانوروں کے ردار بے مقصد نہیں ۔ وہ سماج کے استحصالی طبقے کو برہنہ کرنے کی غرض سے بطور علامت لائے گئے ہی "(۴۵)

اُن کے افسانوں میں علامتی کردار بھی شامل ہیں ۔اس لئے حنیف باوا اپنی تحریروں میں ایسے پسماندہ طبقے کے مفلوک الحال ادبیوں کو پیش کرتے ہیں ۔ جو معاشرے کی ناہمواریاں تو اپنی تحریروں میں دیکھا رہے ہوتے ہیں لیکن معاشرہ ان کو نظرانداز کردیتا ہے۔پھر بھی ایسے لوگ کسمپرسی کی زندگی بسر کرکے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

۱۲۔ بیرون ملک جانے والے محنت کش افراد

ایسے افراد جو اپنے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے دوسرے ممالک کا سفر کرتے ہوں ۔ وہاں رہ کر دن رات محنت کرکے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ غیر ملکی کرنسی ہمارے کرنسی سے بڑی ہے۔ اس لیے کچھ لوگ دو چار سالوں کے لئے بیرون ملک کام کی غرض سے مقیم رہتے ہیں ۔وہاں سے سرمایہ حاصل کرکے اپنے ملک میں کوئی کاروبار شروع کرلیتے ہیں ۔ حنیف باوا کے یہ کردار خود سے وابستہ لوگوں کی خواہشات کو پورا کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ "دوڈبڈُبائی آنکھیں" ایسے کردار کی کہانی ہے جو بیرون ملک صرف

اور صرف اپنے خاندان کی مفلسی کو ختم کرنے کے لیے سفر کرتا ہے۔ جاتے وقت اس کی خالی جیب بہت سی خواہشات سے بھر گئی تھی۔ اس سے بہت سے امیدیں وابستہ ہو گئی تھیں جن کو پورا کرنے کے لیے اس نے دن رات محنت کرتے ہوئے جو کمایا اپنے بچوں کو بھیج دیا۔ "اس نے ان تین سالوں میں دن رات ایک کر کے بہت کمایا لیکن جو بھی کمایا اُن لوگوں کی گرسنہ جھولیوں میں ڈال دیا جنہوں نے اس سے بچھڑتے وقت اپنی خواہشات سے اس کی تمام جیبیں بھر دی تھیں۔" (۴۶)

یہ ایسا پسماندہ طبقہ ہے جو اپنی آسودگی کو دور کرنے کے لیے بیرون ملک سفر کرتا ہے۔ اپنی تمام خواہشات کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے پیاروں سے دور رہ کر ہر وقت سرمایہ کمانے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ایسے طبقے کے کردار وہاں بھی بے بسی اور لاچارگی کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے غمزدہ ہونٹوں سے پھسلتے الفاظ دوسروں کے لئے خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ ایسے افراد خود کو اذیت میں رہ کر دوسروں کو خوشی فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام شبیر اسد مضمون "ہمدردانہ حقیقت نگاری" میں باوا کے متنوع افسانوی موضوعات پر رقمطراز ہیں۔ "حنیف باوا کے افسانوں کا موضوع عدم تحفظ، لاحاصلی کا دکھ، تنہائی، اقتدار حیات کا زوال، ناقدری زمانہ، عصری تضادات، طبقاتی اونچ نیچ وغیرہ ہیں۔" (۴۷) ایک لمحے کی بات " بھی ایسا ہی فسانہ ہے جس کا کردار دڈُلا اپنے کُنبے کی غربت دور کرنے کے لیے بیرون ملک سفر کرتا ہے:

> "ڈُلے اُود کو گئے ہوئے پورے ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ وہ سعودی عرب میں تھا اور اس غربت کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف تھا جس نے پشتوں سے اس کے سارے خاندان کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ بدیس اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا۔" (۴۸)

"دوڈبڈبائی آنکھیں" اور "ایک لمحے کی بات" ایسے افسانے ہیں جس کے کردار بدیس اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے کنبے کے کہنے پر جاتے ہیں۔ دوسرے ملک میں اپنوں سے جدا ہو کر رہنا بڑا صبر آمیز کام ہے۔ لیکن ان افسانوں کے کردار کئی کئی سال تک اُن سے دور رہ کر ان کی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمود شام مضمون "پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں" میں ان افراد پر بات کرتے ہیں۔ "سمندر پار پاکستانیوں کی محنت اور مشقت کے باعث ایک طرف تو گھروں میں کچھ خوشحالی اور آسودگی آئی ہے۔۔۔ اپنے کفیلوں کو بیرون

ملک بھیجنے میں ادھر خاندان جن سماجی الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں۔"(۴۹) اُنہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے ہمارے معاشی نظام سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ لوگ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کیوں بیرون ملک کا سفر کرتے ہیں ؟ یہ سب وہ باتیں ہیں جو وہ اپنے افسانوں اس پسماندہ طبقے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

۱۳۔ کوچوان

اس سے مراد گھوڑا گاڑی چلانے والا، اس پیشے سے وابستہ لوگ گھوڑا گاڑی چلا کر لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے ان سے پیسے وصول کرتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن دور جدید میں اس پیشے سے وابستہ لوگ معاشی بدحالی کا شکار ہیں کیونکہ دور جدید میں ان کی جگہ رکشہ، گاڑی اور موٹر سائیکل نے لے لی ہے۔ ہر شخص اپنی منزل پر جلد سے جلد پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن گھوڑا جانور ہونے کی وجہ سے مشین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حنیف باوا ایسے ہی ایک پسماندہ کردار کی کہانی "فیقا کوچوا ن" کے نام سے بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار کوچوان ہے۔ جو دور جدید میں اپنے جانور سے مشین جتنا کام لینے کے خواہاں ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔ فیقے کوچوان کے بارے میں باوا لکھتے ہیں:

> "اب اس کی آمدنی پر بچوں کی ماہانہ فیس، یونیفارمز، کتابوں اور کاپیوں کا اضافی بوجھ پڑنے لگا۔۔۔۔ آخر اس کی اس سوچ نے اردگرد کے چھوٹی چھوٹی سوچوں سے الجھے ہوئے اپنا ایک راستہ بنا ہی لیا۔ کیوں نا شہر اور گاؤں کے درمیان کے روٹ میں دو چکروں کا اضافہ کر دیا جائے۔ فیقے نے ایسے ہی کیا۔۔۔۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لگاتار اس پر تابڑ توڑ چابک برسائے لیکن اس سے بھی اس کی چال میں بہتری نہ آئی تو سواریوں میں سے ایک نے میرا ہاتھ غصے سے پکڑ لیا۔
>
> " کیوں مارے جا رہے ہو اس بچارے بے زبان کو، جتنی اس میں طاقت ہے اس کے مطابق ٹھیک جا رہا ہے۔ اس سے زیادہ بھلا کیا کرے۔" (۵۰)

وہ فیقے کی معاشی حالت بیان کرتے ہیں۔ معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یہ کوچو ان کس حد تک اپنے جانوروں پر ظلم کرتا ہے۔دور جدید میں ایسے پیشہ ورافراد اپنے آبائی پیشے سے انحراف بھی نہیں کرسکتے اوراس کی پسماندگی کا نوحہ بھی کرتے ہیں۔دراصل ادیب کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے وہ اپنے آس پاس کے تمام موضوعات پر گفتگو کرتا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری افسانہ نگار کے موضوعات پر لکھتے ہیں:

> "اس دنیا میں شہر دیہات ،امیر غریب ،کسان اور مزدور سبھی شامل ہیں ۔ افسانہ نگاروں کا اصل مقصود چونکہ اس دنیا کو بنی نوع انسان کے لیے زیادہ سے زیادہ حیات افروز اور خوش آئند بنانا تھا۔ اس لیے اشتراکیت، جمہوریت ، غلامی، آمریت، مذہبی اجارہ داری، معاشی جبریت، طبقاتی تنگ نظری، نسلی برتری ،نفسیاتی پیچیدگیاں، جنسی الجھنیں، معاشرتی ناہمواریاں سبھی زیر بحث آتے ہیں۔" (۵۱)

اُنہوں نے ہمارے معاشرے کا المیہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ہم اپنی ثقافت سے دور ہو رہے ہیں۔ گھوڑا گاڑی دور قدیم میں بادشاہوں کی پسندیدہ سواری ہوتی تھی لیکن دور جدید میں نئی نسل اس سے ناآشنائی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ وہ اس پسماندہ پیشے اور کردار کو اپنے افسانوں کے ذریعے زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حنیف باوانے جن کرداروں کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔زیادہ تر وہ کردار ہیں جو دور جدید میں پسماندگی کا شکار ہیں۔ حنیف باوا ان کرداروں کی پسماندگی اور معاشی حالت کا نوحہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے کردار ہی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن دورِ جدید میں ان پیشوں سے جڑے لوگ فن کی پسماندگی کی وجہ سے نئے پیشوں سے وابستہ ہو رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے فن اور نسل دنیا سے مٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اُن کے زیادہ تر کردار دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی ثقافت اور فن کو اگلی نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ کردار معاشی بدحالی کا شکار ہونے کے باوجود اپنے فن کو زندہ رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ کیونکہ یہ فن ہی ان کا سرمایہ حیات ہے۔ اُن کے کردار معاشرے کے نچلے طبقے سے ہیں جن کو معاشرہ اورزیادہ ادیب نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن ان کے احساسات وجذبات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کی مشکلات کو بیان کرتے ہیں ۔ اُن کے زیادہ تر کردار باعزت اور خوددار ہیں ۔ ان کو پیش کر کے حنیف باوا

نے نئی نسل کے لیے خودداری کا عَلم بلند کیا ہے۔ حنیف باوا کے نزدیک پسماندہ زندگی ہی انسان کو دنیا کے تجربات سے واقفیت دلاتی ہے۔ حنیف باوا کے کردار عام اور سادہ زندگی کو پہلی ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے کردار پختہ دل اور کچے گھروں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس قسم کے کردار اپنی تحریروں میں پیش کر کے حنیف باوا انسان دوستی کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عابد علی عابد، سید، انتقاد، ادارہ فروغ ادب لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ۹۵

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی قصہ، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء ص ۲۲۶

۳۔ انتظار باقی، حنیف باوا کہانی کار، (مضمون) مطبوعہ: چہار سو، شمارہ ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص ۱۷

۴۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۹

۵۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۱۰۰

۶۔ صفدر علی شاہ، باہر کا آدمی، (مضمون) مطبوعہ: چہار سو، شمارہ ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص ۲۴

۷۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۱۰۱

۸۔ انور سدید، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۶

۹۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۴۱

۱۰۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۲۸۹

۱۱۔ شکیل احمد، ڈاکٹر، اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، نصرت پبلیشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء، ص ۳۷۱

۱۲۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۴

۱۳۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۹۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۵۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۱

۱۶۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۴

۱۷۔ حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، ص ۱۳۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۹۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۷

۲۰۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۹۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۰

۲۲۔ پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۳۱

۲۳۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۷

۲۴۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۸

۲۵۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۲۳۷

۲۶۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۱

۲۷۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، ص ۲۳

۲۸۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۷۸

۲۹۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۸۲

۳۰۔ خورشید عالم، اردو افسانے میں گاؤں کی عکاسی، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۴، ص ۱۹۵

۳۱۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۱۱۶

۳۲۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۱۷۱

۳۳۔ انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو دائری گلڈ الہٰ آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹

۳۴۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۸۵

۳۵۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، ص ۱۲۷

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۶

۳۸۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۸۵

۳۹۔ عائشہ سلطانہ، ڈاکٹر، مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵۷

۴۰۔ http://fridaysspecial.com.pk/2020/06/o5/248565/

۴۱۔ حنیف باوا، اھورے ہاتھ، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۸۹

۴۲۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، مثال پبلشر، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۵۵

۴۳۔ محمود شام، پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں، (مضمون) مطبوعہ: چہار سو، شمارہ ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص ۸

۴۴۔ حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیان، ص ۱۸۸

۴۵۔ پروین اظہر،ڈاکٹر،اردو میں مختصرافسانہ نگاری،ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۱۹۸۷ء،ص۳۱

۴۶۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیان،ص۳۹

۴۷۔ غلام شبیر اسد،ڈاکٹر،ہمدردانہ حقیقت نگاری،(مضمون)مطبوعہ: چہارو،شمارہ۲۳، جولائی،اگست،۲۰۱۴ء، راولپنڈی، ص۲۷

۴۸۔ حنیف باوا،تنہائیوں کے درمیان،ص۱۹۴

۴۹۔ محمود شام،پرانی صحبتیں یادآرہی ہیں،(مضمون)مطبوعہ:چہار سو،شمارہ۲۳،جولائی ،اگست،۲۰۱۴ء، راولپنڈی،ص۸

۵۰۔ حنیف باوا،ادھورے ہاتھ،مثال پبلشر،فیصل آباد،۲۰۱۸ء،ص۷۷

۵۱۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردوافسانہ اورافسانہ نگار،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،اگست ۱۹۸۲ء،ص۱۷

باب چہارم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

معاشرے میں کوئی نظام ایسا نہیں جو ایک دن میں پروان چڑھا ہو۔اس کے پیچھے وہ تاریخی عمل ہوتا ہے جو اسے برس ہابرس سے متحرک رکھنے کے علاوہ تغیر و تبدیلی فراہم کرتا ہے۔دنیاکے کسی بھی خطے کی تاریخ اُٹھائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ ارتقائی مراحل طے کرکے پروان چڑھتاہے۔ کبھی معاشرہ آقائی عہد جس میں معاشرہ آقااور غلام میں تقسیم ہے۔ کبھی مذہبی پیشواؤں اور کلیساؤں پر مشتمل ہے۔انسانی ترقی اور شعور نے معاشرے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیاتو ساتھ ہی سرمایہ دارنہ نظام نے معاشرے کو طبقاتی نظام میں تبدیل کر دیا۔اس نظام کی وجہ سے معاشرہ دو طبقات میں تبدیل ہو ا جن میں اعلیٰ اورادنیٰ شامل ہیں۔صعنتی نظام کی پیدائش نے معاشرے کو تین طبقات میں منقسم کیا۔جو اشرافیہ،متوسط اور نچلے طبقے پر مشتمل ہے۔

برصغیر میں طبقات کا جائزہ لیں تو یہاں کا معاشرہ پہلے پہل ذات پات میں منقسم تھا۔ابتدائی دور میں برصغیر کے باشندے افرادیعنی دراوڑ بغیر کسی تقسیم و تخصیص کے غیر طبقاتی معاشرے میں زندگی بسر کررہے تھے مگر بیرونی حملہ آوروں کی آمد کے ساتھ یہ معاشرہ ذات پات کے نظام سے نکل کر مختلف طبقات میں تقسیم ہوناشروع ہو گیا۔ آریاؤں کے حملے سے پہلی دفعہ یہ معاشرہ طبقات میں تقسیم ہوا۔ آریاؤں نے یہاں کے اصلی باسیوں / باشندوں کو اپنا غلام بنالیااور ان پر ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔برصغیر کا علاقہ اب دوطبقات میں بٹ گیا۔ آقااور غلام۔آریاؤں کے حملہ آور ہونے کے بعد یہ معاشرہ دوطبقات فاتح(کھشتری)اور مفتوح(داس) پر مشتمل تھا۔

برصغیر میں میں جب آریائی تہذیب نہ قدم جما لیے تو یہ معاشرہ اب چار طبقات میں تقسیم ہو چکا تھا جن میں برہمن، کھشتری، ویش اور شودر شامل تھے۔ آہستہ آہستہ برصغیر کے صحراؤں ،جنگلوں اور ساحلِ

سمندر رہنے والے آزاد افراد بھی اس نظام کا حصہ بننے لگے۔ جس سے ایک نیا طبقہ چنڈال سامنے آ گیا۔ اس اضافے کے ساتھ یہ معاشرہ پانچ طبقات تقسیم ہو گیا۔ یہ دور آریاؤں کے عروج کا دور کہلایا۔ آریاؤں نے ذات پات کے نظام کو تقویت دے کر ظلم و جبر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ نچلی ذات یا طبقے والے یعنی ویش اور شودر پسماندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گے۔ اس کشمکش کے حالات میں گوتم بدھ کا نزول ہوتا ہے۔ جب گوتم بدھ کی تعلیمات نے زمانے میں جب فروغ پایا تو ساتھ ہی طبقاتی تقسیم کو باطل قرار دیا گیا۔ اس طرح کے اور واقعات کے ساتھ برصغیر کا نقشہ مسلسل تذبذب کا شکار رہا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد ساتویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس آمد کے ساتھ ہی باقاعدہ طور پر مغلیہ حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ مغلیہ دور میں صوفیاء کرام کا مساوات کا درس اور مغلیہ حکومت کے سیاسی مقاصد دو تحریکوں کی صورت میں چل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اہل ہند کی بھگتی تحریک بھی موجود تھی۔ ان حالات میں نسلی امتیاز اور اور فرقہ واریت پروان چڑھ رہی تھی۔ اس عہد کا معاشرہ جب دو طبقات میں تقسیم ہوا تو جاگیردارانہ نظام نے فروغ پایا۔ یا سمجھ لیں کہ برصغیر میں جاگیرداری کی بنیاد مغلوں کی عطا کردہ نعمت ہے۔ جس سے چھٹکارہ حاصل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اسی نظام کی وجہ سے مغل حکومت کمزور ہو گئی۔ جس کا اصل فائدہ انگریزوں نے حاصل کیا۔ اس جاگیرداری نعمت کی بدولت انگریز مرکزی حکومت بنانے میں کامیاب ہوئے۔

برصغیر میں آریاؤں اور مسلمانوں کے حملوں سے یہاں کی دولت محفوظ رہی لیکن انگریز نے اپنی حکومت میں یہ سرمایہ اپنے ملک بھیجنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے برصغیر کی معاشی حالت زوال کا شکار ہو گئی۔ انگریزوں نے تعلیمی نظام اور جدید صنعتی نظام سے اس معاشرے کا استحصال برقرار رکھا۔ جس کی وجہ سے معاشی بدحالی برصغیر کا مقدر بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انگریزوں کی حکومت میں کسان قحط اور خشک سالی کا شکار رہنے لگے۔ ایک زرعی ملک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس تمام سازش میں انگریزوں کا صنعتی انقلاب عروج کو جا پہنچا۔ لوگ زمینوں کو چھوڑ کر فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اس طرح برصغیر کا جاگیردار اب سرمایہ دار کی شکل میں سامنے آیا۔

صنعتوں کی ترقی اور جدید مشینوں کے استعمال سے ایک نئے مسئلے کا آغاز ہوا۔ یہ مسئلہ بے روزگاری کا مسئلہ تھا۔ مشینوں کی خرابی اور مزدوروں کی ہڑتال وغیرہ جیسے واقعات سے برصغیر میں غربت اورافلاس کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان سب موضوعات پر ادیبوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ان تمام موضوعات پر لکھنے والوں میں حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی،خواجہ احمد عباس ،عصمت چغتائی، جوگندر پال، بلونت سنگھ ،الیاس احمد اوراقبال متین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پاکستان میں زمینداری یا جاگیر داری نظام رائج ہے۔ اس لئے کسانوں کی اب تک اقتصادی وسماجی اور معاشی حالت بہتر نہیں ہو رہی ہے۔ حنیف باواجاگیر داروں کے ظلم و ستم کے بہت سے روپے روپ اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زراعت اور کسانوں سے وابستہ دوسرے طبقوں کی حالت زار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو جاگیر داری نظام دراصل میں اجارہ داری کا نظام لگتا ہے۔ بڑے جاگیر دار چھوٹے زمینداروں سے زیادہ ٹیکس / یونیو کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن چھوٹے زمینداران بڑے جاگیر داروں کے تقاضے / مطالبات پورے نہیں کرسکتے۔البتہ مجبوراًان کے مطالبات کو پورا کرتے ہو وہ قلاش اور مفلس ہو جاتے ہیں۔

حنیف باوا بھی اسی روایت کا حصہ بنے۔انہوں نے موجودہ دور کے تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔جو معاشرے کی پسماندگی کا سبب بنتے ہیں۔کیونکہ کہ انہوں نے معاشرے میں رہ کر وہ تمام دکھ درد خود میں جذب کیے ہیں۔ ان کے یہاں نچلے طبقے کے مسائل پر مبنی افسانے کثیر تعداد میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔نچلا طبقہ بھی سماج کی پیداوار ہے۔اس طبقے اوراس کے مسائل کو، اس طبقے کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب کو حنیف باوانے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔اُن کے ہاں انسان دوستی کامظہر اورانسانی ہمدردی کا احساس ملتاہے۔ آئیں حنیف باواکے افسانوں کامشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کس حدتک اس طبقے کو اپنے حقوق اور سماج میں برابری کا مقام ،بیکاری سے نجات، بھوک و افلاس کا خاتمہ، طبقاتی کشمکش،سماج کی ناانصافیوں ، جاگیر داراور سرمایہ دارکا زوال ،اوراس سے نجات کے لئے نچلے طبقے کوکس حدتک اُکساتے ہیں۔

یہ مقالہ حنیف باوا کے "اردو افسانوں میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر: تجزیاتی مطالعہ" چارابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا باب حنیف باوا کی سوانح حیات پر محیط ہے۔ اس سوانحی حیات میں پیدائش ،خاندان ، آبائی وطن ،ہجرت ، تعلیم ملازمت، آزادی کے واقعات،ازدواجی زندگی ،ادبی خدمات ،پنجابی تصانیف، اعزازات اور مختلف اہل علم کی آراء کو شامل کیا گیا ہے۔ اُن کی زندگی سے جڑے بہت سے واقعات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ اُن کو ادبی دنیا میں پیش آنے والا مسائل کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔ معاشرہ اور طبقات پر بات کی ہے۔ کس طرح افراد کے گروہ سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ جب یہی افرادزیادہ تعداد میں ہو جائیں تو معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ معاشرہ اور طبقات کی وجہ سے پیدا ہونے والی صورتحال اور مسائل کو بیان کیا ہے۔

زرعی اور صنعتی انقلاب کے بعد معاشرے میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔اس سے معاشرے میں غربت،افلاس اور پسماندگی بڑھ جاتی ہے۔ معاشرے میں جو طبقات پائے جاتے ہیں ان کی موجودگی کسی بھی معاشرے میں ناقابلِ تلافی نقصان کو پروان جڑھاتی ہے۔ معاشرے میں تین بڑے طبقات پائے جاتے ہیں ۔جن میں اشرافیہ ،متوسط اور نچلہ طبقہ شامل ہیں ۔یہ طبقات کسی بھی معاشرے کی ترقی میں ناگزیر ثابت ہوتے ہیں ۔اس طبقاتی نطام کو اشتراکی یعنی اجتماعی نظام سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ طبقات معاشرے میں پسماندگی کا سبب بنتے ہیں ۔پسماندگی کی وجہ سے معاشرے ترقی پذیر ہی رہتا ہے۔ پسماندگی کے مظاہر کی وجوہات پر روشنی ڈالیں تو معاشرے میں پسماندگی کی وجوہات میں سب سے اہم کردار طبقاتی نظام کا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں معاشی بحران جنم لیتا ہے۔ پسماندہ لوگوں کا استحصال اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اضافہ کر کے کیا جاتا ہے۔

ذمیندار دار، جاگیر داراور سرمایہ دار طبقہ معاشرے کے افراد حکومت پر حکومت کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں پسماندگی کے پھیلاؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ پسماندگی کے حوالے سے حکومت اور فلاحی تنظیموں کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں بات کی جائے وہ نہ ہونے کے برابر ہیں کیونکہ حکومتی اقدامات یاتو کاغذی قسم کے ہوتے ہیں یا اپنے پارٹی ورک تک محدود ہی ہوتے ہیں۔ پسماندگی کے پھیلاؤ میں دوسری بڑی وجہ زرعی اور صعنتی شعبوں میں جدید مشینری کی بہتات ہے۔ معاشرے میں صعنتی اور

زرعی انقلاب سے مزدوروں کی تعداد میں واضح کمی اور مشینری کی تعداد میں اضافہ ناقابلِ تلافی نقصان کا موجد بنتا ہے۔ پس ماندگی کے پھیلاؤ میں صنعتی اور زرعی انقلاب جہاں معاون ثابت ہوتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کی بڑھتی ہو آبادی کے لیے اشیاء ضروریہ کی پیداوار میں اضافے کا سبب بھی بنتا ہے۔

حقوق کی پامالی اوردوسروں پر خودانحصاری بھی معاشرے میں پسماندگی کی وجہ بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں چودہ سال سے کم اور پینسٹھ سال سے زیادہ عمر کی افراد کی تعداد آبادی کا تقریباً ۲۹ فیصد بنتی ہے۔ یہ افراددوسروں پر خودانحصاری کی وجہ سے معاشرے کی ترقی میں اہم رکاوٹ اور پسماندگی کا پھیلاؤ بنتے ہیں ۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد کے لیے جامع حکمت عملی بنائے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ تعلیم کے شعبے میں جامع منصوبہ بندی کا نا ہونا بھی پسماندگی کے پھیلاؤ کی ایک وجہ ہے۔ پسماندہ طبقہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے سے ناآشنا ہے۔ اس طبقے کا کوئی بچہ اگر تعلیم حاصل کر بھی لیتا ہے تو اپنے خاندان کی پسماندگی دور نہیں کر سکتا۔ معاشرے میں دستکاریوں کی تعلیم کے لیے تربیت گاہوں کا کم ہونا بھی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ میں آتا ہے۔

طبقاتی کشمکش اور جاگیر دارانہ نظام سے پیدا ہونے والی صورتحال پر سیر حاصل بحث شامل ہے۔ معاشرے میں موجود تین طبقات اوران کی اقسام بھی بیان کی ہیں۔ طبقاتی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام سے جنم لینے والے مسائل اور جرائم پر بھی زیر بحث ہیں۔ اس باب میں جاگیر دارانہ نظام کی ابتداء اور مختلف صورتوں میں مختلف علاقوں میں ظہور پربات کے ساتھ اس نظام کے تدارک کے لیے چند ہدایات بھی بیان کی گئی ہیں۔ جن پر عمل کر کے پسماندہ طبقے کے افراد کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور میں معاشی صورتحال پر روشنی ڈالیں تو جاگیر دارانہ نظام معاشرے کی ترقی میں حائل ہے۔ معاشرے میں انسان کی بنیادی ضروریات کی اشیاء پر کی ضروریات کو پورا کر کے معاشی بدحالی کے پھیلاؤ کی وجوہات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ ریاست اور حکومت کے اعلیٰ اقدامات ہی معاشرے کی پسماندگی کا سدباب کر سکتے ہیں۔ صنعتی اور زرعی شعبے میں ترقی کے ساتھ ساتھ گھریلو دستکاریوں کو بھی اہمیت دی جائے۔ تاکہ ریاست کی خواتین بھی پسماندگی کی خاتمے اہم کردارادا کر سکیں۔

جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری نظام کو اشتراکی نظام کے تحت فروغ دیا جائے تاکہ ہر طبقہ اپنی استعداد کے مطابق پسماندگی کے خاتمے کے لیے اپنا حصہ ادا کرسکے۔ پسماندہ طبقہ ذی محنت تو ہے لیکن اس کے برعکس ذی شعور نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کی ساری محنت کا ضیاء ہو جاتا ہے۔ اگر سرمایہ داران کے حقوق کی پامالی کرنا بند کردیں تو معاشرہ خود بخود ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ حنیف باوا کی کہانیوں میں معاشی بدحالی، طبقاتی کشمکش، ثقافتی پسماندگی اور پسماندہ طبقے کے شعبے اور کردار شامل ہیں۔ باب دوم "حنیف باوا کے اردو افسانوں میں پسماندہ طبقے کی کہانیوں" پر مشتمل ہے۔ جس کا الف جزو "معاشی بدحالی کی کہانیوں" اور معاشی بدحالی کی وجوہات پر محیط ہے۔ مختلف لغات سے معاشی بدحالی کی تعریف اور مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ معاشی بدحالی کے معاشرے پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔

معاشی بدحالی معاشرے میں جاگیرداری، طبقاتی کشمکش، اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ ان لوگوں کے استحصالی رویوں کی بدولت معاشرے میں غربت، افلاس اور قحط کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ تمام عناصر کسی معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں تو معاشرے میں جرائم پیشہ افراد کی تعداد اور معاشرتی مسائل میں بے حد اضافہ ہوتا ہے۔ معاشی بدحالی کا شکار لوگ حسد، بغض، فسادات، چوری چکاری جیسے رویوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ معاشی بدحالی کسی بھی ترقی یافتہ معاشرے کا معاشی نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔ حنیف باوا جن افسانوں میں معاشی بدحالی کا شکار لوگوں کی عکاسی کرتے ہیں اس جزو میں ان افسانوں کی نشاندہی کر کے ان کو منظرعام پر لانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے کس طرح اپنے افسانوں میں غربت کی لائن سے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے اس کو ظاہر کیا گیا ہے۔

معاشی بدحالی پر کام کرنے والے حکومتی محکموں، نجی فلاحی تنظیموں اور معاشی بدحالی کا شکار لوگوں سے سروے میں شامل کیے ہیں۔ انہوں نے معاشی بدحالی پر جو انٹرویو دیا اس کو بھی شامل کیا گیا تاکہ معاشی بدحالی کے اسباب کھل کر سامنے آجائیں۔ مختلف تنظیموں اور پسماندہ لوگوں سے سروے میں معلوم ہوا کہ پسماندگی کی بڑی وجہ ابھی تک دیہی علاقوں میں جاگیرداری نظام ہے۔ اس نظام کے تحت ایک زمیندار اپنے علاقے میں کچھ افراد کو رعایا کے طور پر بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ رعایا اس کی تابع دار ہوتی

ہے،ان کی اچھی بری تقدیر کا فیصلہ اب اس زمینی خدا کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ رعایا نسل در نسل ان کی غلامی کرتی ہے۔ برصغیر میں یہ نظام انگریزوں کے آنے سے شروع ہوا اور اب ایک مضبوط نظام کے تحت پاکستانی معاشرے میں موجود ہے۔ اب یہ نظام تعلیم اور شعور کی بدولت منطقی انجام کو پہنچ سکتا ہے۔ اس نظام کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ معاشی بدحالی کا شکار ہے۔

اس باب کے (ب) جزو میں " طبقاتی کشمکش کی کہانیوں " پر بات کی ہے۔ مختلف طبقات ان کی اقسام اور طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا عصری تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ دور حاضر میں طبقات کی وجہ سے معاشرہ کن مسائل سے دوچار ہوتا ہے یہ بھی بیان کیا ہے۔ طبقاتی نظام مغربی ممالک سے برصغیر میں آیا۔ برعظیم کا علاقہ اس وقت طبقات میں پہلی دفعہ تقسیم ہوا جب آریاء یہاں آئے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی یہاں کے لوگوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم ہو گیا۔ یہاں کے لوگ غلام بن گے۔ آریاؤں نے جب ذات پات کے نظام کو فروغ دیا تو نچلہ طبقہ کسمپرسی کی گزانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی وجہ سے معاشرہ تین بڑے طبقات میں بٹ جاتا ہے۔ جو معاشرے کی ترقی کے لیے ناگزیر ثابت ہوتا ہے۔ حنیف باوا اپنی کہانیوں میں اس نظام کے تحت پیدا ہونے والے جرائم اور مسائل پر بات کرتے ہیں۔

اُنہوں اپنے افسانوں میں اشرافیہ کی سفاکی اور نچلے طبقے کی بے بسی کو نمایاں کرتے ہیں۔ نچلے طبقے میں دبے دبے غصے کے ساتھ بے بسی بھی ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی طبقاتی نظام سے نفرت کے اظہار کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس باب میں نسل در نسل غلامی اور طبقاتی نظام کے نقصانات پر بھی بات کی گئی ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے اثرات کا جائزہ بھی پیش کیا ۔ حنیف باوا نے اپنے افسانوں میں سرمایہ پرست ماحول کو بھی موضوع بنایا ہے۔ سرمایہ پرستی میں جرم واستبداد کی کس طرح پروان چڑھتی ہے اور نچلہ طبقہ کس طرح اشرافیہ کا آلہ کار بنتا ہے ان تمام باتوں کی جھلک ہمیں ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔

جزو(ج) ثقافتی پسماندگی کی کہانیوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ثقافت کی تعریف اور مفہوم کے ساتھ ساتھ اس کی اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاشرے میں ثقافت کی اہمیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ

معاشرے کی پہچان کا سبب بنتی ہے۔ ثقافت ہی معاشرے کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اگر ثقافت کے پھیلاؤ کا جائزہ لیں تو شروع میں انسان جنگلوں میں رہتا اور جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے نئی نئی ایجادات اور باتیں سیکھ لیں۔ اس کے ساتھ ہی ثقافت کا تصور پیدا ہوا۔ برصغیر کی ثقافت آریاؤں کے آنے سے تبدیل ہوئی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایک جاندار تہذیب و تمدن لے کر آئے تھے۔ اردو افسانے میں ثقافتی پسماندگی کی روایت کا چلن ہمیں ابتدائی افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے۔

دورِ حاضر میں نئی نسل کا تہذیب و ثقافت سے ناآشنائی کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ ختم ہوتی ثقافت کے نقصانات بھی درج کیے ہیں۔ اُن کی کہانیوں مٹتی ثقافت کی علمبردار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بنیادی قسم کی تہذیب و ثقافت کے پھیلاؤ پر زور دیا گیا ہے۔ آباؤ اجداد کے ثقافتی پیشوں سے انحراف موجودہ دور میں ترقی کی راہ میں اہم رکاوٹ ہے۔ معاشرہ اور ثقافت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ ثقافت معاشرے اور افراد کی پہچان ہوتی ہے۔ کیونکہ معاشرے اور افراد کی تقسیم کاری ثقافت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ حنیف باوا کے افسانوں میں ثقافتی پسماندگی کے ساتھ ان پیشوں کا ذکر بھی موجود ہے جو ہمیں اپنے اجداد سے ورثے میں ملا ہے۔ لیکن دورِ حاضر میں جدید ٹیکنالوجی کی بدولت ہم ان پیشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں۔ ثقافتی پسماندگی کے حوالے سے تمام مسائل ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ثقافت کے حوالے سے سب سے بڑی بات ان کی تحریروں میں موجودہ نسل کے لیے مشرقی ثقافت سے آشنائی موجود ہے۔

باب سوم "حنیف باوا کے افسانوں میں پسماندہ طبقے کے کرداروں کا عصری تناظر میں تجزیاتی مطالعہ" پر مشتمل ہے۔ اس میں کردار نگاری کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ کرداروں کی مختلف اقسام پر مفصل بات کی ہے۔ پسماندہ طبقات کے حوالے سے مرکزی، ثانوی اور ضمنی کرداروں پر بحث کی گئی ہے۔ وہ پسماندہ طبقے کے جو کردار پیش کرتے ہیں وہ درج ذیل پیشوں سے منسلک ہیں۔ خوانچہ فروش ایسے افراد جو ریڑھی، پرات یا ٹھیلے وغیرہ پر اپنا سامان فروخت کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے مسائل اور معاشی بدحالی کو بیان کیا ہے۔ گداگر ایسے پیشے سے وابستہ لوگ بھیک مانگ کر اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ گداگروں کے اقسام اور بھیک

مانگنے کے طریقے پر بات کی ہے۔ گدگروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے معاشرہ کس حد تک متاثر ہوتا ہے اس پر بھی بات کی ہے۔ اُن کے اردو افسانوں سے گداگر مختلف روپ دھار کر بھیک مانگتے ہیں۔ ان کے کے مسائل اور حکومتی پالیسیوں پر بات کی گئی ہے۔

اس کے بہت سے پیشے اور کردار مثلاً موچی، میراثی، مزدور، دیوانے، ملازمت پیشہ افراد، محنت کش عورتیں، کوچوان، بیرون ملک ملازمت کی تلاش میں جانے والے افراد اور مفلوک الحال ادیبوں کا ذکر ملتا ہے۔ حنیف باوا ان تمام المیوں کو قریب سے دیکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کا موضوع بھی اُن کے آس پاس کے ماحول سے اخذ شدہ ہے۔ اس لئے ان کے افسانوی موضوعات تمام طبقات کا احاطہ پر مبنی ہیں۔ پسماندہ طبقے اور پیشوں پر لکھے ہوئے اُن کے افسانوں کے مطالعے سے نچلے طبقے کے افراد کا درد وکرب اورافلاس و غربت مکمل طور پر ہمارے سامنے آشکار ہو جاتی ہے۔ یہ طبقہ معاشرہ میں گھٹن، بھوک اور غریبی کا شکار نظر آتا ہے۔ حنیف باوا کے اکثر افسانے مزدور طبقہ کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ معاشرتی نظام میں سب سے زیادہ اگر قابلِ رحم حالت کا کوئی طبقہ ہے تو وہ نچلا طبقہ ہے۔

قومی اور نجی فلاح و بہبود کے اداروں کے سروے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ معاشرے میں بڑھتی ہوئی غربت اورافلاس کا خاتمہ ان اداروں کا اہم فریضہ ہے۔ اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے آج بہت سے لوگ غربت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہیں۔ حکومت، سول سوسائٹی، بین الاقوامی ادارے اور کئی ایک مخیر افراد اسی سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ یہ ادارے کم آمدنی والے گھرانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور زندگی کے معیار کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں ۔ یہ امداد اور قرضے زیادہ تر پیداواری مقاصد کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اس امر سے پسماندہ افراد بھیک یا خیرات کی جگہ عزتِ نفس اور خود انحصاری کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان اداروں کے پاس زیادہ تر پچھی دیہی آبادیوں کے لوگ مالی معاونت کے حصول کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اس قسم کی امداد اور بلا سود قرضے سے نادار افراد کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ غربت سے پریشان لوگ مختلف جرائم میں ملوث ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کاروبار سے باعزت روزگار کمانے پر مامور ہو گئے ہیں۔ ان اداروں کی بدولت معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے۔

اُن کے افسانوں میں وہ تمام کردار کے جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتے شامل ہیں۔وہ سماج کے منجھے نباض ہیں ۔ اُن کے افسانوں میں دہی زندگی کے مسائل کے ساتھ شہری زندگی کے مسائل نظر آتے ہیں۔ اُن کے خیال میں سماج اورانسان ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں ۔ اُن کی بہت سی کہانیاں عصرحاضر کے ظلم و ستم اور جبریت کی عکاس ہیں۔ یہ کہانیاں اُن کے افسانوی سفر کی داستان بن گئی ہیں ۔جدید تہذیب اوردیہی زندگی کے ایک منجھے ہوئے نباض بھی ہیں۔اُن کے زیادہ تر افسانوی موضوعات میں زندگی کا استحصال ،معصومیت، اخلاقی اقداراور طبقاتی کشمکش پر مبنی ہیں ہیں۔ ان کے یہاں جہالت وغربت اورافلاس کی نشاندہی ملتی ہے۔ پسماندہ طبقے کے دکھ درداور کرب اُن کے خمیر میں شامل ہیں۔

کیونکہ انہوں نے ایسے معاشرے میں جنم لیا جو پسماندگی کا شکار تھا۔حنیف باوا ان کرداروں سے جڑے تمام دکھ درداپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں ۔اُن کو پسماندہ طبقے کا نمائندہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ان کی تحریروں میں دکھ درد کا نمایاں عنصر قاری کی توجہ کا بنیادی جزو بنتا ہے۔

اُن کے افسانوں میں زمیندار طبقے کا استحصال اور ظلم وجبر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اُن کی تمام ہمدردیاں پسماندہ طبقے سے وابستہ دیکھائی دیتی ہیں ۔ان کے افسانوں میں زمیندارانہ نظام کے ابھرتے ہوئے نئے نظام (صعنتی نظام) کو بظاہر دیکھا جاسکتا ہے۔انہوں نے اشرافیہ اورنچلے طبقے کے درمیان کشمکش اور منافرت کا اظہار بھی کیا ہے۔ادیب کے لیے عصری آگہی اوراپنے عہد سے متاثر ہونا بے حد ضروری ہے۔ہر ادیب اپنے دائرہ کار میں اپنے گردو پیش کے ماحول میں پھیلے ہوئے طبقات کو پیش کرتا ہے کیونکہ یہ اس کے طبقاتی شعور کا اظہار ہے۔حنیف باواکا اس لحاظ سے پسماندہ طبقہ پسندیدہ طبقے کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

اُن کے تمام افسانوں کے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو افسانے کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں تمام سماجی مسائل اورپرانی روایت و رسوم و رواج کو سموتے نظر آتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں معاشی مسائل،ناداری، غربت اور غریبوں کی مجبوری وبے بسی کی لازوال داستانیں موجودہیں۔ یہ داستانیں فردواحد کی نہیں بلکہ پوری دنیا کے افراد کا احاطہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔وہ موجودہ دور کے تقریباً سبھی سماجی پہلوؤں کو بے نقاب اور عریاں کرتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں ہمیں

رومانوی داستان کم اور سماجی و اقتصادی حقیقت نگاری کا مرقع نظر آتا ہے۔ الغرض حنیف باوا اپنے افسانوں میں نچلے طبقے کی سماجی زندگی اور مسائل کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں۔

ب۔ تحقیقی نتائج

حنیف باوا کے اردو افسانوی مجموعوں "تنہائیوں کے درمیاں" اور "ادھورے ہاتھ" میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل نتائج اخذ کیے گے ہیں۔

۱۔ حنیف باوا کی زیادہ تر کہانیوں میں طبقات کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر معاش سے جڑی ہوئی ہیں ۔اُن کے کردار معاشی تنگ دستی کا شکار ہیں۔ تمام عمر یہ کردار معاشی آسودگی کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ لاچاری اور بے بسی کو حنیف باوا عمیق نظر سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ نچلے طبقے کی نمائندگی اُن کی کہانیوں کا مرکزی موضوع ہے۔

۲۔ حنیف باوا کے کردار داخلی اور خارجی دونو ں طرح کے مسائل پیش کرتے ہیں ۔ تمام کردار پسماندہ طبقے اور پیشوں سے اخذ کیے ہیں ۔ جس طرح کا کردار ہے ویسے ہی پیش کرتے ہیں۔ حنیف باوا کے کردار تمام عمر معاشی تنگ دستی سے آسودگی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ کردار بہت سے جرائم و مسائل میں ملوث ہو کر معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۳۔ حنیف باوا کے کردار اپنی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ جب وہ اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے تو وہ جن ذہنی الجھنوں سے گزرتے ہیں حنیف باوا ان کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشی بدحالی سے مجبور ہو کر یہ کردار مانگنے، چوری اور دوسرے بہت سے مسائل کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ ان کرداروں کے اس افعال سے معاشرے پر منفی اثرات پڑتے ہیں۔ اس لیے ان کے دکھ، درد و کرب میں اضافہ ہوتا ہے۔

ج۔ سفارشات

۱۔اس تحقیق میں حنیف باوا کے اردو افسانوی مجموعوں "تنہائیوں کے درمیاں" اور "ادھورے ہاتھ" میں پسماندہ معاشرت کا عصری تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ان افسانوی مجموعوں کا موضوعاتی تجزیہ بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔حنیف باوا کے اردو اور پنجابی افسانوی مجموعوں کے تقابل پر تحقیق کی جا سکتی ہے۔

۳۔حنیف باوا کی غیر افسانوی نثر (خاکوں اور انشائیوں) پر کام کیا جا سکتا ہے۔

۴۔حنیف باوا کے اردو اور پنجابی افسانوی مجموعوں کا موضوعاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

حنیف باوا، تنہائیوں کے درمیاں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۲ء
حنیف باوا، ادھورے ہاتھ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

ثانوی مآخذ

انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد، ۱۹۸۳ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۱ء
انور سدید، ڈاکٹر، مختصر افسانہ۔ عہد بہ عہد، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۲ء
ایلن ووڈز، بالشوازم۔۔ راہِ انقلاب، مترجمہ، ایس این شوریدہ، طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز، لاہور، مارچ ۲۰۰۱ء
انجم نیازی، ایک تنہا آدمی، فیضا الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، یکم جنوری، ۲۰۰۷ء
ابو اعلی مودودی، اسلام اور جدید معاشی نظام، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۶۹ء
ابو فراز (مترجم)، مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس از ایلن وڈز / ٹیڈ گرانٹ، طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
بلال زبیری، تاریخ جھنگ، جھنگ ادبی اکیڈمی، جھنگ، ستمبر ۱۹۷۶ء
پروین اظہر، ڈاکٹر، اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء
خالد وحید، پریم چند کے افسانے (حقیقت نگاری اور دیہی زندگی کے مسائل) ایجوکیشن بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
خیر الدین انصاری، لہکتی ڈال، انصاری پبلی کیشنز، جھنگ، جنوری ۲۰۰۰ء
خورشید عالم، اردو افسانوں میں گاؤں کی عکاسی، نیشنل پبلی کیشنز ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، دانیال، کراچی، ۲۰۱۴ء

سلیم آغا قزلباش،ڈاکٹر،جدید اردو افسانے کے رجحانات،انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۰ء
سلیم احمد،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۸ء
سلیم اختر،ڈاکٹر،افسانہ اور افسانہ نگاری،سنگ میل لاہور،۱۹۹۱ء
شکیل احمد،ڈاکٹر،اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،ایجو کیشن بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۱۴ء
شفیع ہمدم،پر فیسر،دل دوستاں سلامت،مجید بک ڈپو جھنگ صدر،مارچ ۲۰۰۰
شفیق انجم،ڈاکٹر،اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۸ء
شکیل احمد،ڈاکٹر،اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی،نصرت پبلیشر،لکھنؤ،۱۹۷۴ء
شہزاد منظر،جدید اردو افسانہ،منظر پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۰ء
شہزاد منظر،پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال،جامعہ کراچی،۱۹۹۷ء
علی عباس جلالپوری،سید،رسومِ اقوام،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء
علی عباس جلالپوری،روایاتِ فلسفہ،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء
علی عباس جلالپوری،سید،روح عصر،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء
علی عباس جلالپوری،سید،تاریخ کا نیا موڑ،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء
علی عباس جلالپوری،جنسیاتی مطالعے،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۳ء
عائشہ سلطانہ،ڈاکٹر،مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ،ساقی بک ڈپو،دہلی،۱۹۹۵ء
عابد علی عابد،سید،انتقاد،ادارہ فروغ ادب لاہور،۱۹۵۴ء،
غلام مرتضیٰ شاکر ترک،پاکستانی معاشرہ،علمی کتب خانہ،لاہور،۱۹۷۸ء
فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۷ء
فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردو افسانہ اور افسانہ نگار،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۸۲ء
فیروزالدین،(مرتب) فیروزاللغات،فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۱۸ مئی ۲۰۱۴ء
گوپی چند نارنگ،ڈاکٹر،(مرتب) اردو افسانہ روایت اور مسائل،ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی،۱۹۸۱ء
مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،اردو افسانے کی روایت،اکادمی ادبیات اسلام آباد،۱۹۹۱ء
مسعود رضا خاکی،ڈاکٹر،اردو افسانے کا ارتقاء،مکتبہ عالیہ لاہور،۱۹۸۷ء

مبارک علی، ڈاکٹر، پاکستان کا معاشرہ، عوامی پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۲ء
مبارک علی، ڈاکٹر، جاگیر داری اور جاگیر دارانہ کلچر، فکشن ہاؤس کاہور، ۱۹۹۶ء،
وقار عظیم، سید، فن افسانہ نگاری، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء
وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء
وقار عظیم، سید، ہمارے افسانے، اردو مرکز لاہور، ۱۹۵۰ء

رسائل وجرائد

چہار سو (ماہنامہ) راولپنڈی، شمارہ: ۲۳، جولائی، اگست، ۲۰۱۴ء

انٹرویو

حنیف باوا، (انٹرویو) از حافظ محمد ثاقب نیاز، جھنگ، ۲۱ جولائی ۲۰۲۰ء، بوقت بارہ بجے دن

انٹرنیٹ ذرائع

http://fridaysspecial.com.pk/2020/06/o5/248565/